آزادی

(ناول)

دیپک بُدکی

برادرم سلیم سالک صاحب کی خدمت میں

ہدیۂ خلوص

دیپک بُدکی

31.03.23.

آزادی

(ناول)

دیپک بُدکی

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۲

AZADI (Novel)

By : DEEPAK BUDKI

Year of Ist Edition : 2022
ISBN : 978-93-95400-80-0
Price: Inland: Rs 200.00, Foreign: $5.00

نام کتاب : آزادی (ناول)
مصنف : دیپک بُدکی
پتا : ۱۰۲-اے، ایس جی امپریشن، سیکٹر۴-بی، وسُندھرا، غازی آباد-۲۰۱۰۱۲
ای میل : deepak.budki@gmail.com موبائل:9868271199
قیمت : درون ملک:-/۲۰۰ روپے (دوسوروپے) ؛ بیرون ملک: پانچ ڈالر
اشاعت : پہلاایڈیشن - ۲۰۲۲ء
مطبع : روشان پرنٹرس، دہلی-٦

ملنے کے پتے

☆ہمالیہ بک ورلڈ، حیدرآباد-Ph.040-66822350
☆صفی بک ایجنسی ممبئی- M.9820480292
☆بک امپوریم، پٹنہ-M.09304888739
☆پاریکھ بک ڈپو، لکھنؤ-M.9389456786
☆مرزاورلڈ بک ہاؤس، اورنگ آباد-M.09325203227
☆کشمیر بک ڈپو، سری نگر-M.09419761773
☆وطن پبلیکیشنز، سری نگر-M.09419003490
☆نعیم بک سیلرز، مئوناتھ بھنجن-M.09450755820
☆دکن ٹریڈرس، حیدرآباد-Ph.040-24521777
☆کتاب دار، بک سیلر، پبلشر، ممبئی-Ph.09869321477
☆عثمانیہ بک ڈپو، کلکتہ-M.09433050634
☆رائی بک ڈپو، الہ آباد-M.07905454042
☆ایجوکیشنل بک ہاؤس، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ-
☆مکتبہ علم وادب، سری نگر-M.094419407522
☆قاسمی کتب خانہ، جموں-M.09797352280

پاکستان میں ملنے کا پتہ : ملک بک ڈپو، چوک اردو بازار، لاہور (پاکستان) Ph. 0092-42-37247480 37231388

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

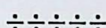
H.O. D1/16, Ansari Road, Darya Ganj, New Delhi-110002 (INDIA)
B.O. 3191,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)
Ph: 45678286, 23216162, 45678203, 41418204
E-mail: info@ephbooks.com,ephindia@gmail.com
website: www.ephbooks.com

انتساب

اپنے مادرِ وطن کے نام

تحریر ظهری

اس ناول کے سبھی کردار، مقامات اور واقعات فرضی ہیں۔ کسی شخص، مقام یا واقعہ سے کوئی مناسبت محض اتفاق ہو سکتا ہے جس کے لیے مصنف یا ناشر پر کوئی ذمّے داری عاید نہیں ہو گی۔



پیش لفظ

میرا پہلا ناول 'اپنا اپنا سچ' گذشتہ برس منظر عام پر آچکا ہے۔ یہ ناول کشمیر سے جڑی یادوں سے تعلق رکھتا ہے۔ اس ناول کو میں نے کورونا وائرس کے تاریک دور میں رقم کیا جب زندگی ٹھہری سی گئی تھی اور کمپیوٹر کے سوا اور کوئی ساتھی نظر نہیں آرہا تھا۔ گھر سے باہر قدم نہ رکھنا، دو گز کی دوری رکھنا، بار بار ہاتھ صاف کرنا اور ماسک پہننا معمول بن گیا تھا۔ اسی دوران میرے دل میں خیال آیا کہ کیوں نہ میں افسانوں کے بدلے ناول لکھنے کی کوشش کروں۔ وقت بھی ہے، موسم بھی ہے اور دیرینہ آرزو بھی ہے۔ چند پلاٹ ذہن میں کئی برسوں سے کلبلا رہے تھے، اس لیے میں نے ایک پلاٹ کو عملی جامہ پہنانے کی سعی کرلی۔ اِس طرح ناول 'اپنا اپنا سچ' عالم وجود میں آ گیا۔

مذکورہ بالا ناول لکھتے لکھتے ایک اور پلاٹ، جو تیس برس سے یونہی میرے دماغ کے کسی گمنام گوشے میں بے حس و حرکت پڑا تھا، وقتاً فوقتاً دستک دیتا رہا۔ جلد باز ہونے کے سبب میں اتنے طویل عرصے کے دوران ناول لکھنے کی ہمت نہیں جٹا پا رہا تھا۔ ۱۹۹۰ء میں میری برادری سے تعلق رکھنے والے کشمیری پنڈت جبری ہجرت کے باعث بے گھری، بے وطنی اور بے ثباتی کے شکار ہو گئے جس کا میں خود چشم دید گواہ رہا ہوں۔ ان کی رقت انگیز حالت دیکھ کر مجھ سے رہا نہ گیا۔ جہاں ایک جانب میں نے جموں میں دفتری طور پر ان پناہ گزینوں کی حتی المقدور مدد کی، وہیں دوسری جانب مجھے ان کی اندوہناک اور قابل رحم حالت پر قلم اٹھانے کی شدید چاہت ہوئی۔ بد قسمتی سے میں نے ۱۹۷۸ء میں افسانے لکھنا ترک کیا تھا۔ مگر اس شدید طلب کی وجہ سے میں اپنے آپ کو روک نہیں پایا، اس لیے 'گیان ساگر' کے قلمی نام سے ایک افسانہ بعنوان 'آزادی' رقم

کیا جو روزنامہ 'ہند سماچار'، امرتسر میں ۱۹۹۲ء کے آس پاس شائع ہوا۔ اس کے باوجود دن رات کی دفتری مصروفیات نے مجھے تخلیقی کام کرنے سے مزید کئی برس تک باز رکھا۔ ۱۹۹۶ء میں ذاتی زندگی نے ایسی کروٹ لی کہ میرا قلم دوبارہ متحرک ہوگیا اور میں نے مسلسل ایک کے بعد ایک افسانے لکھے جیسے کوئی آتش فشاں پھٹ گیا ہو۔ ان افسانوں میں کچھ وہ افسانے تھے جو میں نے ۱۹۷۱ء سے لے کر ۱۹۷۸ء تک قلم بند کیے تھے اور بعد میں وقتی جنون کی زد میں آ کر نذر آتش کیے تھے، ان کو میں نے یادوں کے دفینے سے نکال کر دوبارہ رقم کیا جبکہ کچھ بالکل نئے تجربات پر مبنی تازہ افسانے تھے۔ اب تو خیر ان افسانوں کا شمار ۱۵۰ر سے زیادہ ہوگیا ہے۔

بہر حال افسانہ 'آزادی' میرے ذہن میں معطل ہو کر رہ گیا تھا اور اس کو میں نے دوبارہ جوں کا توں اس لیے قلم بند نہیں کیا کیونکہ مجھے محسوس ہوا کہ اس افسانے کا کینواس بہت بڑا ہے اور اس پر ایک بھرپور ناول لکھا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ناول 'اپنا اپنا سچ' کے ساتھ ساتھ ہی میں نے اس پلاٹ پر بھی کام کرنا شروع کیا۔ انجام کار اس پلاٹ نے ایک نیا ہی رنگ و روپ اختیار کر لیا۔ یہاں یہ تحریر کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس ناول کا تانا بانا تمام تر تصور اور تخیّل کی اپج ہے اور اس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ یہ ایک زندہ، روشن خیال، غیر جانبدار اور عینیت پسند معاشرے کا علامیہ ہے جو تخریب کے بدلے تعمیر کا متقاضی ہے۔

مجھے پورا یقین ہے کہ اس ناول کا اردو دنیا میں پرتپاک خیر مقدم ہوگا اور قارئین اس کو پڑھ کر محظوظ ہوں گے۔ مجھے ان کے ردِ عمل کا انتظار رہے گا۔

دیپک بُدکی

وسُندھرا، غازی آباد - ۲۰۱۰۱۲

۲/اکتوبر ۲۰۲۲ء

(۱)

ایک چھوٹی سی دنیا تھی وہ۔ پرسکون اور اطمینان بخش۔ کوئی اختلاف نہ کوئی جھگڑا۔ ٹرین نہ ٹرام، ٹیلی ویژن نہ موبائیل۔ کچھ ایک گھروں میں ریڈیو تھے۔ سبھی بزرگ تازہ خبریں اور موسم کی پیش گوئی سننے کے لیے بیقرار رہتے، نوجوان ریڈیو سیلون سے 'بِنا کا' گیت مالا سننے کے لیے بدھوار کو سبھی کام کاج چھوڑ دیتے اور بچے اتوار کی صبح بچوں کا پروگرام سننے کے لیے ریڈیو کے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتے۔ مارِ عشق کے ڈنک سے بے حال لڑکے اور لڑکیاں بھی تھیں، جب دیکھو تب پرانی فلموں کے گیت سننے میں مگن۔ ریڈیو کی آواز اتنی اونچی ہوتی کہ سارے محلے میں گونجتی اور سامنے والے مکان میں رہ رہی معشوقہ کے کانوں میں بھی پڑتی اور وہ برہ کی آگ میں سلگتی۔ مگر کیا مجال کہ کوئی ایک دوسرے سے براہ راست مخاطب ہونے کی جرأت کرتا۔ دونوں کو اس بات کا احساس تھا کہ سامنے والے کے دل میں کچھ کچھ ہو رہا ہوگا پھر بھی نہ جانے کیوں دونوں کو گھبراہٹ ہوتی، جھجھک ہوتی اور سنکوچ بھی ہوتا۔ ایک دوسرے کی عزت و ناموس کا خیال انھیں آگے بڑھنے سے روکتا۔

''نہ جانے کیا سوچے گی اگر میں نے پیش قدمی کی؟'' لڑکا اپنے آپ سے من ہی من میں سوال کرتا۔

''نہ جانے میرے بارے میں کیا خیال کرے گا اگر میں نے سامنے آکر مسکرا دیا اور اپنے عشق کا بے باکانہ اظہار کیا؟'' دوسری جانب لڑکی تردّد میں پڑ جاتی۔

دونوں انہی وسوسوں اور اندیشوں میں برس ہا برس گزارتے۔ پھر شہنائیاں بجتیں۔ لڑکی

کہیں اور لڑکا کہیں اور بیاہے جاتے اور دل کے ارمان آنسوؤں میں ڈھل جاتے۔ شادی کی رسم سے پہلے عاشق کے منہ سے بے تحاشہ نکل پڑتا۔ ''کہدو کوئی نا کرے یہاں پیار۔ اس میں خوشیاں ہیں کم، بے شمار ہیں غم، اک ہنسی اور آنسو ہزار۔''

اور کچھ دنوں کے بعد دونوں اپنی گھر گرہستی میں الجھ کر سب کچھ بھول جاتے۔ تڑپنا.... آہیں بھرنا... آنسو بہانا.... اندر ہی اندر بھسم ہونا۔

ان دنوں عشق کا عالم ہی نرالا تھا۔

اگر اتفاق سے عشق پروان چڑھ بھی جاتا تو گھر سے میلوں دور اسکول یا کالج کے گیٹ کے باہر یا سینما ہال کی تاریکی میں۔ کالج کے پھاٹک کے باہر بے چارہ عاشق گھنٹوں انتظار کرتا تب جا کر معشوقہ، سفید کرتے وشلوار میں ملفوف اور سر اوڑھنی سے ڈھکا ہوا، کالج سے باہر قدم رکھتی۔ ظاہر ہے کہ وہ اکیلی نہیں ہوتی بلکہ اس کی سہیلیاں ساتھ ہوتیں۔ سنگ مرمر کی چلتی پھرتی مورتیاں جونہی کالج سے باہر نکلتیں تو ایسا محسوس ہوتا کہ سفید رنگ کے میمنوں کا ریوڑ چل رہا ہے۔ سچ پوچھو تو عاشق بڑی مشکل سے اپنی والی کو پہچاننے میں کامیاب ہوتا کیونکہ سب کی سب لڑکیاں ایک جیسی دکھائی دیتیں۔

محبوبہ بار بار پیچھے مڑ کر دیکھ لیتی جبکہ اس کا مجنون فاصلہ رکھ کر اس کا سایہ بنا چلتا رہتا۔ بس وہی تعاقب، وہی آگے تم اور پیچھے ہم۔ گھر پہنچنے میں آدھا پون گھنٹہ تو لگ ہی جاتا تھا، تب تک دونوں ایک دوسرے کو جی بھر کے دیکھ لیتے۔ شام کو جب چاند نکل آتا اور سارا ماحول چاندنی میں نہا لیتا تو محبوب کے ریڈیو سے لتا منگیشکر اور منا ڈے کا گانا گونجتا۔ ''آجا صنم مدھر چاندنی میں ہم تم ملے تو ویرانے میں بھی آجائے گی بہار..''

ان دنوں فلم دیکھنے کے لیے کئی بہانے تلاش کرنے پڑتے تھے۔ کالج سے آدھے دن غیر حاضر رہنا پڑتا تھا۔ ابتدا میں تو کئی سہیلیاں ایک ساتھ فلم دیکھنے چلی جاتیں مگر رفتہ رفتہ جب کسی لڑکے اور لڑکی کے تعلقات گہرے ہو جاتے تو وہ الگ سے ایک دوسرے کے ساتھ فلم دیکھنے

چلے جاتے۔ پھر بھی اس بات کا خیال رکھنا پڑتا تھا کہ کوئی رشتے دار دیکھ نہ لے۔ بہتر راہ عمل یہ ہوتی تھی کہ پہلے لڑکی سینما ہال میں گھس کر سیٹ پر بیٹھ جاتی اور پھر لڑکا چپکے سے اندر آ کر اس کی بغل میں بیٹھ جاتا۔ عاشق کے لیے ایک اور مصیبت یہ ہوتی تھی کہ ٹکٹ کے لیے اسے پیسوں کا انتظام کرنا پڑتا تھا۔ اس زمانے میں طالب علموں کو جیب خرچ ملنے کا رواج نہیں تھا۔ بس یوں ہی کتاب، کاپی، پنسل یا پین کا بہانہ بنا کر والدین سے کچھ پیسے اینٹھ لیے جاتے اور انہی پیسوں سے ٹکٹ خرید لیے جاتے۔ کبھی کبھار تو نوبت یہاں تک آ جاتی کہ شریر لڑکے اپنی کتابیں تک بیچ دیتے اور پھر گھر میں کہتے کہ کلاس میں کوئی چوری کر کے لے گیا۔ خیر محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے۔

بہت ہی چھوٹی دنیا تھی۔ کم ضرورتیں، محدود آمدنی کے ذرائع اور قلیل تنخواہیں...! سب کچھ سستا تھا جیسے تیسے کام نکل ہی جاتا تھا۔ ڈیڑھ دو سو کی گورنمنٹ نوکری مل جاتی تو سمجھ لو کوئی خزانہ پا لیا۔ سارا خاندان خوشیوں سے جھوم اٹھتا۔ پرائیویٹ کمپنیوں اور ان میں ملازمت کرنے کا کوئی چلن ہی نہ تھا۔ لے دے کے شہر میں دو چار کارخانے تھے جہاں ریشم، اونی کپڑا یا قالین بنائے جاتے۔ ریشم کارخانے میں ایک بار ہڑتال کیا ہوئی کہ اسے روس کے انقلاب سے موازنہ کیا گیا۔ چونکہ مزدوروں کی حق تلفی ہو رہی تھی اس لیے سرکار کو ان کی مانگیں پوری کرنی پڑیں۔ اکثر لوگ کھیتی باڑی، میوہ باغات میں مزدوری، ملاحی، دکانوں میں ملازمت یا پھر دست کاریوں کے ساتھ جڑے رہتے تھے۔ اگر خود کفیل ہوتے تو خود ہی تاجر بن جاتے۔ ہر کسی کے چہرے پر طمانیت، اور قناعت نظر آتی تھی۔ اس لیے مالک دو جہاں کی شکر گزاری اور اطاعت کرنا اپنا فریضہ سمجھتے تھے۔

ایسا بھی نہیں تھا کہ انھیں کوئی غم نہ تھا، کوئی کمی نہ تھی یا پھر کسی مصیبت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا مگر وہ اسے اپنا نصیب سمجھ کر درگزر کرتے تھے۔ بیوہ عورتیں بچھڑے ہوئے شوہر کی یادوں کے سہارے باقی ماندہ عمر کاٹ لیتیں۔ دوسری جانب مرد تھے کہ مرد اساس سماج میں سارے حقوق کے مالک بن بیٹھے تھے۔ اِدھر بیوی مری نہیں اُدھر دوسری لانے کے لیے شہنائیاں بج اٹھتیں، دوسری

رحمت حق ہو جاتی تو تیسری تیار بیٹھی رہتی کولہو کا بیل بننے کی خاطر۔ عمر کا تفاوت کون دیکھ لیتا تھا۔ کہیں تو یہ حالت ہوتی کہ اُدھر ماں بچہ جن رہی ہوتی اور اِدھر بیٹی۔ کہیں کسی لڑکے کا ماما عمر میں بھانجے سے بھی چھوٹا ہوتا تھا۔ بہر کیف نہ جانے کیوں اس چھوٹی سی دنیا میں کہیں کوئی نفسا نفسی کا تانڈو نظر نہیں آتا تھا، کوئی سماجی ریس دکھائی نہیں دیتی تھی اور نہ ہی کہیں کسی مرئی خلا کا احساس ہوتا تھا۔

اس چھوٹی سی دنیا میں انسان کتنا محفوظ اور پُرسکون تھا۔ سو سال جی کر بھی آدمی دیوی کے مندر میں متھا ٹیکنے کے لیے پہاڑی کی سیکڑوں سیڑھیاں طے کر لیتا تھا۔ ذیابیطس نہ مرض قلب...! سبھی لوگ ایشور کے شکر گزار تھے۔ کبھی کسی کی زبان سے یہ نہیں سنتے تھے کہ ''ہے بھگوان مجھے اٹھا لے، بہت جی لیا میں۔'' بھلا کوئی خود کو کیوں کوستا۔ دیکھ بھال کے لیے ڈھیر ساری اولادیں اور بہوئیں تھیں۔ خوش رہنے کے لیے پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں تھیں۔ ان کے ساتھ جی بہل جاتا تھا۔ کوئی ٹوپی اتارتا، کوئی عینک کھینچ لیتا اور کوئی ہاتھ سے کتاب چھین لیتا۔ ظاہری طور پر بچوں کو ڈانٹا جاتا مگر دل ہی دل میں مسرت ہوتی اور یہی چاہت ہوتی کہ وہ بندروں کی طرح کھیلیں کودیں، کندھوں پر چڑھیں اور چھینا جھپٹی کریں۔

بہر حال اس بات سے انکار کرنا مشکل ہے کہ ماضی میں اکثر لوگ کم عمر میں ہی مر جاتے تھے لیکن جو زندہ رہتے وہ تندرست ہوتے تھے اور ان میں سے کچھ لوگ سنچری بھی پار کر لیتے تھے۔ ان دنوں عام طور پر آدمی جوانمرگ ہو جاتے۔ دو تین دن بیماری نے آدبوچا، حکیم وید ڈاکٹر، جو کوئی دستیاب ہوتا، سارے نسخے آزماتا مگر کوئی کارگر نہیں ہوتا اور مریض دم توڑ دیتا۔ زچگی سے اتنا خطرہ لاحق ہوتا کہ اللہ کی پناہ۔ کبھی زچہ نہیں رہتی اور کبھی بچہ نہیں رہتا۔

آخری سفر کرنے میں قباحت ہی کیا ہے؟ مرنا تو ہر کسی کو ایک نہ ایک دن ہے۔ پچاس کی عمر میں مرے یا پھر نوے کی عمر میں! کم سے کم ایڑیاں رگڑ رگڑ کر تو نہ مرے۔ چلتے پھرتے مرنا کتنا اچھا ہوتا ہے۔ ورنہ کئی برس شریر میں رسولی پالتے رہو، دکھ درد جھیلتے رہو، پین کِلر کھاتے رہو، ہر قسم کی برقی شعائیں بدن میں جذب کرتے رہو، آنسو بہاتے رہو اور موت کا بے صبری سے

انتظار کرتے رہو۔ آپریشن کراؤ، بدن کو جراحوں کی تجربہ گاہ بناؤ، اسے انجکشنوں اور نمونۂ خون لینے والی سوئیوں سے چھلنی کراؤ اور پھر کٹا پھٹا، بریدہ بدن لے کر باقی ماندہ زندگی بسر کرلو اور یہ سوچ کر خوش ہو جاؤ کہ چلو کچھ اور سانسیں ادھار مل گئیں۔ یا پھر کبھی کبھار نباتی زندگی بسر کرلو اور دنوں کیا مہینوں یوں ہی پڑے رہو۔ کہاوت ہے کہ موت بھلی کہ جان کندنی۔

یہ حقیقت ہے کہ ان دنوں غربت تھی۔ جنت بے نظیر میں رہ کر بھی مقامی بچے اس جنت کا نظارہ کرنے کے لیے ترستے تھے۔ کبھی کبھار والدین کسی میلے میں جانے کا فیصلہ کرتے تو مان لو گھر میں عید ہو جاتی۔ کئی دن پہلے سے تیاریاں شروع ہو جاتیں، پھٹے پرانے کپڑوں کو ٹانکے لگوائے جاتے، جوتوں کی مرمت کروائی جاتی اور پورے گھر میں خوشیاں منائی جاتیں۔ صبح سورج نکلنے سے پہلے ہی سب تیار ہو جاتے کہ بابا آج مغل گارڈن یا بادام واری کی سیر کرائیں گے۔ کبھی کبھار سب رشتے دار مل کر ڈونگا بک کر لیتے اور ہفتے بھر کے لیے کھیر بھوانی کی یاترا کرنے چلے جاتے۔ پورے راستے گہما گہمی رہتی تھی، اتنے سارے لوگوں کے لیے ناشتہ، لنچ اور ڈنر کا انتظام کرنا پڑتا تھا۔ سبھی عورتیں مل جل کر کام چلا لیتی تھیں۔ کھیر بھوانی میں دیوی کے درشن ہوتے ہی ساری تھکن دور ہو جاتی تھی اور تشفی وطمانیت محسوس ہوتی۔ مگر کبھی لینے کے دینے بھی پڑتے تھے۔ اچانک موسم خراب ہونے کے سبب زوروں کی بارشیں ہوتیں، جہلم دریا میں سیلاب آجاتا اور ڈونگا بیچ دریا میں خوفناک لہروں کے زیر و بم کا شکار ہو جاتا۔ یاتریوں کا کلیجا دھک سے رہ جاتا اور زندگی وموت کے درمیان بہت کم فاصلہ رہ جاتا۔ خوش قسمت ہوتے تو بچ نکلتے ورنہ لقمۂ اجل بن جاتے۔

کچھ علاقے انگریزوں کے زمانے سے طبقۂ اشرافیہ کے لیے مختص ہو چکے تھے۔ ایک تھا ڈل جھیل کا کنارہ جس کو بلیوارڈ کہتے ہیں اور دوسرا جہلم کا کنارہ جس کو بنڈ کہتے ہیں۔ بلیوارڈ پر عام لوگوں کا آنا جانا بہت کم ہوتا تھا۔ اگر جاتے بھی تو کئی روز سے تیاریاں کر کے گھر کے بزرگوں کے ساتھ جیسے کسی متبرک جگہ کی زیارت کرنے جانا ہو۔ آمد و رفت کے وسائل بہت کم ہوتے تھے، البتہ ایتوار اور چھٹی کے دن کافی بسیں اس روٹ پر چلتی تھیں۔ آسودہ لوگ کبھی کبھار

پورا تانگہ دن بھر کے لیے کرائے پر لیتے اور پورا کنبہ نہرو پارک، چشمہ شاہی، نشاط باغ اور شالیمار باغ کا نظارہ کر کے لوٹ آتے کیونکہ ہارون دیکھنے کے لیے ٹائم ہی نہیں بچ جاتا تھا۔ ان دنوں ڈل جھیل کو پار کر کے حضرت بل درگاہ اور نسیم باغ دیکھنے کا رواج نہیں تھا۔

بنڈ کا منظر کچھ اور ہی ہوتا۔ سورج ڈھلنے کے بعد فرنگی اور دیسی سیاح جوق در جوق نظر آتے یا پھر مقامی امرا ہاتھ میں موٹھ دار چھڑیاں یا کین لیے ہوئے اپنے نہائے دھوئے اور کنگھی کیے ہوئے جھبرّے کتوں کو ٹہلانے کے لیے چہل قدمی کرتے۔ بنڈ پر یک طرفہ بنی ہوئی دکانوں کی سجاوٹ دیکھتے ہی بنتی تھی۔ بے چارے دکانداران فرنگی اور دیسی سیاحوں کا صبح سے شام تک انتظار کرتے۔ بیشتر سیلانی دن بھر سرینگر سے ملحق صحت افزا مقامات کی سیر کرنے چلے جاتے اور شام کو لوٹنے کے بعد خریداری کے لیے اپنے ہاؤس بوٹوں یا ہوٹلوں سے نمودار ہوتے اور بنڈ کی طرف نکل آتے۔ بہت ہی صاف ستھری جگہ تھی۔ گو زیادہ تر ہاؤس بوٹ ڈل جھیل میں لنگر انداز ہوتے مگر کئی ہاؤس بوٹ تو نگین جھیل اور جہلم دریا کے کناروں پر بھی نظر آتے تاہم عام طور پر سیاح ڈل جھیل کے ہاؤس بوٹوں کو ہی ترجیح دیتے۔ شام کو بنڈ پر ان سیاحوں کا کارواں بہت ہی خوشنما لگتا تھا۔

سرینگر کے بارے میں گوتم سپرو نے اپنے ہسٹری ٹیچر سے سنا تھا کہ اس کے دو حصے ہیں، ایک وی آئی پی لوگوں کا، ایئر پورٹ سے چشمہ شاہی گیسٹ ہاؤس تک، اور دوسرا عام رعایا کا۔ جب بھی کوئی ملکی یا غیر ملکی رہنما چلا آتا ہے تو اسے ایئر پورٹ سے سیدھے گیسٹ ہاؤس تک مرسیڈیز کاروں میں لے جایا جاتا ہے۔ پس منظر میں نیلاہٹ لیے دلکش اودے پہاڑ اور پیش منظر میں ڈل جھیل کا نیلا صاف وشفاف پانی۔

جب روسی رہنما کرسچوف اور بلگانن آئے تھے تو ان کے استقبال کے لیے سارا سرینگر امنڈ کر جہلم کنارے کھڑا ہو گیا تھا۔ اس وقت ریاست میں بخشی غلام محمد پرائم منسٹر ہوا کرتا تھا۔ کرسچوف، بلگانن اور نہرو نے دریائی جلوس کی صورت میں کشتیوں میں بیٹھ کر کشمیر کا نظارہ دیکھا تھا۔ چہار سو خوشنما چہرے نظر آرہے تھے۔ ہر گھاٹ پر اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ ہاتھوں میں

چھوٹے چھوٹے حریری جھنڈے لیے استقبال کے لیے کھڑے تھے۔ علاوہ ازیں لوگوں کی بھیڑ بھی جمع تھی۔ کئی لوگ تو دیگر مضافات سے بھی چلے آئے تھے۔ کیا دلفریب منظر تھا۔ کشتیوں کی قطاریں، ڈونگوں میں بینڈ باجا، مقامی ساز وسنگیت، بچّہ نغمہ یعنی فوک ڈانس اور کشمیر کی جھانکیاں۔ جہاں دیکھو وہاں تماشائی نعرے لگاتے ہوئے اور پھول برساتے ہوئے مہمانوں کا سواگت کر رہے تھے جبکہ مہمان دونوں جانب مڑ مڑ کر ان کی محبتوں کا جواب ہاتھ ہلا ہلا کر دے رہے تھے۔ جس نے وہ منظر دیکھا ہوگا وہ اُس وقت آج کے کشمیر کا تصور کر ہی نہیں سکتا تھا۔

(۲)

روسی رہنماؤں کی آمد کے پانچ سال بعد گوتم سپرو کا جنم ہوا۔ اس کے بچپن کے دن بہت ہی جوکھم بھرے تھے۔ ایک نچلے متوسط برہمن طبقے کا فرد، جہلم دریا کے کنارے شہر کے مرکزی بھیڑ بھاڑ والے علاقے حبہ کدل کا رہنے والا، آس پاس ہر شئے محتاجی وتنگ دستی میں ڈوبی ہوئی، جہاں دیکھو وہاں بھول بھلیاں جیسی تنگ گلیاں جو کیچڑ وگندگی میں لت پت رہتیں کیونکہ ان کی ٹوٹی ہوئی فرش کی کبھی مرمت ہی نہیں ہوتی تھی۔ صبح سویرے ایک جانب عبادت گاہوں کی طرف جانے والوں کی ہوڑ لگی رہتی اور دوسری جانب فضلہ گیر سروں پر ٹوکریاں اٹھائے اور ہاتھ میں کدالیں لیے سورج کی کرنیں پھوٹنے سے پہلے ہی بول براز صاف کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ گندگی اور بدبو سے انھوں نے سمجھوتا کیا تھا۔ البتہ وقت کے ساتھ ساتھ یہ رواج بدل گیا۔ نہ وہ فضلہ بردار رہے اور نہ ہی وہ پرانے بیت الخلا۔ ان کی جگہ سیمنٹ کے پاخانوں نے لے لی جن کے سبب فضلہ پانی کے ساتھ نالیوں میں بہہ کر جہلم دریا کو آلودہ ومکدّر کرنے لگا۔ نتیجتاً نالیوں میں بہتی نجاست کی وجہ سے ہر سو بدبو ہی بدبو پھیلنے لگی۔ کوئی اس کا تدارک کرنے کو تیار ہی نہ تھا۔ مرکزی ڈرینج سسٹم کا کہیں نام ونشاں نہ تھا۔ لوگ بدبو سے بچنے کے لیے پھرن کے بازو یا رومال

سے ناک کو ڈھک لیتے اور پھر عبادت گاہوں کی طرف یا دوسرے کاموں کے لیے چلے جاتے۔ بہر کیف دلوں میں تسکین، قناعت اور بشاشت تھی جو کارخانۂ حیات کو کہیں رکنے نہیں دیتی تھی۔

کشمیری برہمن ہمیشہ تعلیم کو ترجیح دیتے رہے۔ چنانچہ وادی میں روزگار کے وسائل محدود تھے اس لیے قدیم زمانے ہی سے تعلیم یافتہ کشمیری پنڈت وادی چھوڑ کر سبزہ زاروں کا رخ کر لیتے۔ تاریخ گواہ ہے کہ پڑھے لکھے نوجوان مرتبہ اور روزگار پانے کی خاطر مغل، اودھ اور دکنی درباروں میں حاضری دیتے رہے۔ دیکھا جائے تو برہمنوں کے پاس رکھا ہی کیا تھا، بس پوتھی پڑھ لیتے اور اسی کے سہارے اپنی زندگی بسر کرتے۔ فارسی اور اردو میں کئی کشمیریوں نے ان درباروں میں نام کمایا، بے شمار دیوان مرتب کیے اور بڑے بڑے عہدے پائے۔ جہاں تک اردو ادب کا تعلق ہے، رتن ناتھ سرشار، دیا شنکر نسیم، برج نرائن چکبست، دتا تریہ کیفی، کشن پرساد کول، پریم ناتھ در، آنند نرائن مُلا وغیرہ اس کارواں کے چند اہم نام ہیں۔ نہرو، کاٹجو، سپرو، کول، دھر وغیرہ ملک کے سیاسی افق پر ستاروں کی طرح چمکتے رہے۔ فوج، ایڈمنسٹریشن، فلموں اور دیگر پیشوں میں بھی کئی کشمیری برہمنوں نے ملک اور ملک سے باہر اپنا لوہا منوالیا۔ اتنا ہی نہیں علامہ اقبال اور سعادت حسن منٹو کے خاندانوں کے تار بھی کشمیری برہمنوں سے جڑے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ ماضی میں کئی راجاؤں جیسے للتادتیہ، اونتی ورمن وغیرہ کا طوطی بولتا تھا۔ فلسفہ اور تاریخ کے حوالے سے بھی کئی نامور شخصیات گزری ہیں جیسے ابھینو گپت، کلہن، جونا راجہ، بھاسکر، سوم دیو بھٹ، اتپل دیو، واسو گپت، لل دید وغیرہ۔

پانچ سال مکمل کرنے کے بعد گوتم سپرو کا داخلہ ایک نزدیکی سرکاری جبری اسکول میں کرایا گیا۔ اس روز ماں باپ اور بہنیں خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ پتا جی نے رواج کے مطابق نانبائی سے دو روپے کی بتیس روٹیاں خریدیں اور بیٹے کے سر پر وار کر کتوں کو کھلائی تھیں۔ اُدھر ماں تہری وکلیجی بنا کر اور بھیڑ کا کچا پھیپھڑا لے کر ہاری پربت چلی گئی اور وہاں شارِکا دیوی کو بھینٹ چڑھادی۔ اس کے بعد پھیپھڑے کے ٹکڑوں کو اوپر منڈلاتی چیلوں کو کھلا دیا۔ گھر لوٹ کر

تھری اور کلیجی پورے کنبے اور ہمسایوں میں بطور پرساد بانٹ دی۔ گوتم سپرو کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ ماجرا کیا ہے حالانکہ اس کو نئی پوشاک، نیا بستہ، سلیٹ، تختی، کھریا مٹی کی دوات اور چند نرکل کے قلم ملے تھے جنھیں وہ بار بار دیکھ کر خوش ہو رہا تھا اور اپنے ہمجولیوں کو بھی دکھا رہا تھا۔

اسکول میں فیس نہ ہونے کے برابر تھی۔ اسکول ہی کیا یونیورسٹی تک تعلیم مفت تھی جس کی غرض و غایت تعلیم کو عام کرنا اور ناخواندگی کو مٹانا تھی۔ دراصل ڈوگرہ حکومت نے جبری اسکولوں کا ایک جال سا بچھا دیا تھا۔ انھوں نے ریاست سے ناخواندگی مٹانے کے لیے بچوں کو زبردستی اسکول میں حاضری دینے کا حکم صادر کیا تھا۔ مگر ان اسکولوں کی حالت بہت ہی خستہ تھی اور ان میں بنیادی سہولتیں دستیاب نہیں تھیں۔ عمارت شکستہ حال، چھت ٹوٹی پھوٹی جس میں سے بارش یا برف کے دنوں میں پانی رس رس کر کمروں میں ٹپکتا تھا، دیواروں پر مٹی کا پلستر جگہ جگہ سے اترا ہوا تھا اور ہر جگہ دھول ہی دھول نظر آ رہی تھی۔ طلبہ زمین پر بچھی پرانی اور پھٹی ہوئی پٹ سن کی ٹاٹ پر بیٹھ کر تعلیم حاصل کرتے تھے۔ علم سے زیادہ وہ گرد و غبار میں اٹے ہوئے اسکول سے گھر واپس آتے تھے۔

گوتم سپرو کے گھر والے اسے کسی اچھے اسکول میں بھیج سکتے تھے مگر وہ تین چار کلومیٹر کی دوری پر تھے۔ اس کی عمر بہت کم تھی اور پھر دو لڑکیوں کے بعد وہ ایک لڑکا بڑی منتیں مانگ کر پیدا ہوا تھا۔ اس لیے والدین نے نزدیک ہی اسکول میں بھیجنا مناسب سمجھا تاکہ نظروں کے سامنے رہے۔ بہر حال ان دنوں استاد بہت ہی ایمان دار اور مخلص ہوتے تھے۔ بچوں کو تعلیم دینے میں وہ اپنی ساری قوت صرف کرتے تھے۔ اس اسکول میں گوتم سپرو پانچ برس تک تعلیم حاصل کرتا رہا۔ اس کی محنت اور خلوص کو دیکھ کر اساتذہ اس کا خاص خیال رکھتے تھے۔ انہی اساتذہ کی بدولت گوتم سپرو بہت ہی خوشخط لکھنے لگا تھا اور گنتی، پہاڑے اور حساب پر اس کی اچھی خاصی گرفت تھی۔

(۳)

گوتم کے پتاجی دینا ناتھ سپرو بڈگام ہائی اسکول میں ریاضی کے استاد تھے۔ بہت ایمان داراور دِین دار تھے۔اسکول کے بعد ٹیوشن کرنا گناہ سمجھتے تھے حالانکہ میتھس ٹیچر کی ہر وقت مارکیٹ میں طلب رہتی تھی۔ پوچھنے پر کہتے تھے کہ میں کلاس میں بچوں کو سکھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتا پھران کو اسکول کے بعد استاد کے پاس جانے کی کیا ضرورت ہے۔خود اپنے گھر میں بھی بال بچوں کو محنت کرنے اور ایمانداری کی تلقین کرتے تھے۔اسکول میں ان کی بہت عزت ہوتی تھی کیونکہ وہ ایک ایسے استاد تھے جو جی جان لگا کر طلبہ کو پڑھاتے تھے۔ریاضی کا مضمون تو سب سے زیادہ کٹھن مانا جاتا ہے مگر ماسٹر دینا ناتھ کے سمجھانے کا ڈھنگ ایسا تھا کہ طلبہ آسانی سے ہر سوال حل کرنے میں کامیاب ہوتے۔ سالانہ امتحانات میں اس کی جماعتوں کے نتیجے بہت اچھے ہوتے۔یہی وجہ تھی کہ اس کے کئی رفیق کار اس سے خار کھاتے مگر منہ پر کچھ نہ بولتے۔

اس زمانے میں اساتذہ کی تنخواہیں زیادہ نہیں ہوتی تھیں تاہم دینا ناتھ کی بیوی جے کشوری اتنی سادگی اور قناعت سے گھر چلاتی تھی کہ کبھی ایسا محسوس ہی نہیں ہوتا تھا کہ گھر میں کسی چیز کی قلت ہے۔گھر کا سارا کام کاج وہ خود ہی کرتی یا پھر اپنی دو بیٹیوں سے کراتی جن کی عمر میں صرف دو سال کا فرق تھا۔دونوں بیٹیوں نے دل لگا کر خوب پڑھائی کی، گریجویشن پاس کر کے ان کی شادی نمائشی طمطراق کے بغیر بڑی سادگی سے انجام پائی۔ بڑی لڑکی کا شوہر پنجاب نیشنل بنک اور چھوٹی کا ڈاک وتار محکمے میں کلرک تھا۔ان دنوں پنجاب نیشنل بنک کا قومیانہ نہیں ہوا تھا۔ایمان داری کا ایک تو پھل مل گیا کہ دونوں منگیتروں نے کسی جہیز کی مانگ نہیں کی۔تاہم لڑکیوں نے والدین کی استطاعت کے مطابق چند عام گھر گرہستی کی چیزیں اور سہیلیوں کے دیے ہوئے کچھ تحفے اپنے ساتھ سسرال لائے۔ والدین نے سنسکار ایسے عطا کیے تھے کہ

سسرال میں قدم رکھتے ہی اس کو سورگ بنا دیا۔ دیکھا جائے تو یہ ان کے ماں باپ کے کرموں کا پھل تھا کہ نیک داماد مل گئے ورنہ جہیز اکٹھا کرتے کرتے بیشتر غریب کشمیری پنڈت لڑکیوں کی جوانی ڈھل جاتی ہے۔

کشمیری پنڈتوں کی قوم نرالی ہے۔تضاد سے بھر پور...!ایک تو برہمن اور اس پر اٹلکچول۔محفلوں میں گفتگو کرتے وقت ہر کوئی جہیز کے خلاف بولتا ہے اور اسے سماجی ناسور تسلیم کرتا ہے مگر جب اپنی باری آتی ہے یعنی جب اپنے بیٹے کی بات چلتی ہے تو پورا ماپ تول کر جہیز مانگ لیتے ہیں۔ اِس کا تجربہ دینا ناتھ کو اس دن ہوا جب وہ اسٹاف روم میں بیٹھا اپنے رفیق کاروں سے جہیز کی لعنت پر بحث کر رہا تھا۔ اس کے ایک رفیق کار نے کہا۔" بھائی تم کیا سمجھو گے بیٹی کا بوجھ کیا ہوتا ہے۔تم نے تو بِنا کسی جہیز کے اپنی دونوں بیٹیوں کی شادی کر دی مگر سبھی کو مفت میں ایسے بَر نہیں ملتے۔ میری دو بیٹیاں ہیں ان کی شادی جہیز کی وجہ سے نہیں ہو پا رہی ہے۔ میں اسکول کے بعد بھی رات بھر ٹیوشن پڑھاتا ہوں پھر بھی اتنا سارا جہیز جمع نہیں کر پا رہا ہوں۔ ایک تو لڑکیوں کو پڑھاؤ لکھاؤ اور پھر ان کے لیے جہیز جمع کر لو۔سچ تو یہ ہے کہ ہمارا سماج کٹھور، بے حس اور بے رحم ہے۔"

" بھائی صاحب، ایسا تو نہیں ہونا چاہیے، وہ تو پڑھی لکھی اور ہونہار لڑکیاں ہیں۔آپ کوشش تو کیجیے،ضرور کوئی نہ کوئی لڑکا مل جائے گا۔"

" دینا ناتھ جی، آپ کس دنیا میں رہتے ہیں، آج کل تو کوئی لڑکا جہیز کے بغیر شادی کرنا مانتا ہی نہیں۔" گفتگو سن رہے چند اور اساتذہ نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔" دینا ناتھ نے اپنے رفیق کار کو چارہ ڈالا۔" آپ ایک کام کیجیے، آپ مجھے بتائیں کہ آپ کو اپنی لڑکیوں کے لیے کیسے بَر کی تلاش ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کو اپنی پسند کے حساب سے ان کے لیے موزوں لڑکے ڈھونڈ کر دے دوں گا جو آپ سے کوئی مطالبہ نہیں کریں گے۔"

''واہ، نیکی اور پوچھ پوچھ۔ دونوں گریجویٹ ہیں، اچھا لڑکا ہو، اچھی سی نوکری کرتا ہو، اور کیا چاہیے۔''

''چلو پھر ٹھیک ہے۔ مگر میری ایک شرط ہے۔''

''وہ کیا....؟''

''ان کے لیے تو میں لائق لڑکے ڈھونڈ لوں گا۔ مگر تمھارے دونوں بیٹوں کے لیے بھی میں ہی لڑکیاں ڈھونڈ لوں گا۔ وہ جونہی تعلیم ختم کریں گے تو ان کو بھی کسی جہیز کے بغیر شادی کرنی ہوگی۔ بو لیے منظور ہے۔''

رفیق کار گہری سوچ میں پڑ گیا۔ پھر کہنے لگا۔ ''دینا ناتھ جی، آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ میرا ایک بیٹا میڈیکل اور دوسرا انجینئرنگ کی تعلیم پا رہا ہے اور وہ بھی ریاست سے باہر کالجوں میں۔ ایک تو داخلے کی بھاری بھرکم فیس اور اس پر ہوسٹل میں رہنے کا سالانہ خرچہ....! دونوں نے سرکار سے قرضہ لے رکھا ہے۔ وہ قرضہ کیسے اُتر جائے گا؟ میں نے تو سوچا تھا کہ شادی کے بعد ان کے سسرال والے کچھ مدد کریں گے ورنہ تو ان بے چاروں کی عمر سرکار کا قرضہ اتارتے بیت جائے گی۔ اس لیے میں یہ وعدہ کیسے کر سکتا ہوں۔''

جواب سن کر سبھی لوگ حیراں ہو گئے۔ وہ سب گہری سوچ میں پڑ گئے۔ بہر حال دینا ناتھ نے اپنا مدعا پا لیا تھا۔ وہ جو ثابت کرنا چاہتا تھا اس نے وہ کر دکھایا۔ دراصل انسان کی کتھنی اور کرنی میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ سماج کو برا بھلا کہنا تو آسان ہوتا ہے مگر انسانیت کے اصولوں پر خود عمل کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ جب خود پر بن آتی ہے تو انسان اپنے ہی بنائے ہوئے اصولوں کو فراموش کرتا ہے۔ آخر سماج کیا ہوتا ہے، افراد کا اجتماعی روپ، اگر فرد اپنا فرض نبھائے تو سماج خود ہی سُدھر جائے گا۔ ورنہ عدل وانصاف، ایمانداری و پارسائی، نیکی و بدی کی تمیز، سب کچھ دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔

خیر گفتگو ختم ہوگئی اور سبھی اپنے اپنے گھروں کی طرف چل دیے۔

(۴)

گوتم نے امتیازی نمبر حاصل کر کے ہائیر سیکنڈری کا فائنل امتحان پاس کیا۔ پتا جی کی خواہش تھی کہ وہ انجینئر نگ کالج میں داخلہ لے مگر اس کی قسمت میں کچھ اور ہی لکھا تھا۔ ابھی گھر میں نتیجے کی خوشیاں منائی ہی جا رہی تھیں کہ ماسٹر دینا ناتھ کو ہارٹ اٹیک ہو گیا اور اسے اسپتال میں بھرتی کرنا پڑا۔ اسپتال کا ایک جونیئر ڈاکٹر اس کا شاگرد رہا تھا، اس نے زمین آسمان ایک کر دیے اور اسپتال کے بڑے سے بڑے کارڈیولوجسٹ سے اپنے استاد کا معائنہ کروایا مگر ہونی کو کون ٹال سکتا تھا۔ اسپتال سے ماسٹر دینا ناتھ کی لاش ہی واپس گھر جا سکی۔

گھر میں کہرام مچ گیا۔ خبر سنتے ہی بیٹیاں سسرال سے فوراً آ گئیں۔ رشتے دار بھی سب حاضر ہوئے۔ جے کشوری مسلسل روتی رہی، بسورتی رہی، بین کرتی رہی اور اپنے پتی کے مردہ جسم سے سوال کرتی رہی کہ ''تم نے مجھے کس کے سہارے چھوڑ دیا؟ میں نے ایسا کونسا پاپ کیا تھا کہ تم مجھے اس نرک میں چھوڑ کر چلے گئے۔ جانا تھا تو مجھے بھی ساتھ لے کر چلے جاتے۔ تمھارا بیٹا اب کس کے سہارے جی پائے گا۔ اس بے چارے نے تو ابھی زندگی کی شروعات بھی نہیں کی ہے۔''

دوپہر میں لاش کو نہلا کر ارتھی سجائی گئی اور کمسن بیٹے کو ارتھی کو کاندھا دینا پڑا۔ شمشان گھاٹ پر گوتم نے ہی انتم سنسکار کیا اور چِتا کو آگ دکھائی۔ رسم و رواج کے مطابق اسے جو کچھ کہا گیا وہ اس نے بڑی تابعداری اور عاجزی سے کیا اگرچہ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب اچانک کیوں اور کیسے ہوا۔ ابھی تو اس نے عملی طور پر زندگی کا پہلا ہی قدم اٹھانے کی کوشش کی تھی پھر یہ آفت اس کے سر پر کیوں آئی؟ وہ انہی خیالوں میں غرق چِتا کے گرد چکّر لگاتا رہا۔ واپسی پر وہ گھر میں چپ چاپ اپنے کمرے میں گھس گیا، نہ کسی سے ملا اور نہ ہی کسی سے کوئی بات کی۔ گھر میں جو بھی آتا جے کشوری سے تعزیت کا اظہار کرتا۔ بہنیں چونکہ بالغ اور شادی شدہ تھیں

اس لیے گھر کا کام کاج سنبھالتی رہیں۔ جیسا کہ کشمیری برہمنوں میں رواج ہے، اگلے گیارہ دن گھر میں پتا جی کی روح کی شانتی کے لیے ہر روز شرادھ کا آیوجن ہوتا رہا۔

پھر سب لوگ اپنے اپنے گھروں کی طرف روانہ ہو گئے اور گھر سونا سونا سا لگنے لگا۔ جس گھر میں کچھ برس قبل پانچ لوگ ہنسی خوشی رہتے تھے وہاں اب صرف دو روحیں، ماں اور بیٹا، بچی ہوئی تھیں جو اپنی اپنی دنیا میں کھو گئے۔ نہ آپس میں زیادہ میل جول اور نہ ہی وہ پرانی سی گھما گھمی۔ گوتم کو اس بات کا احساس ہو گیا کہ وہ اب بن باپ کی اولاد ہے اور ماں کا وجود اس پر مکمل طور پر منحصر ہے۔ اس کو چھوڑ کر جانا ناممکن ہے۔ پَر کٹے پرندے کی طرح اس کی اڑان اب موقوف ہو چکی تھی۔

اس کے سامنے ایک بہت بڑا سوال کھڑا ہو گیا اور وہ تھا کہ اس کا آگے کا لائحہ عمل کیا ہوگا؟ گھر کے حالات دیکھ کر انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کرنا اور وہ بھی ریاست سے باہر جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ پتا جی کی پنشن ماں کو ملنے لگی تھی مگر اتنی کم و قلیل رقم صرف زندہ رہنے کے لیے کافی تھی، انجینئرنگ تعلیم حاصل کرنا تو بعید از قیاس تھا۔ اس پر مصیبت یہ کہ سرکار نے اسے ریجنل انجینئرنگ کالج کالی کٹ، کیرالہ میں سیٹ الاٹ کر دی۔ اس نے بہت کوشش کی کہ مقامی ریجنل انجینئرنگ کالج میں سیٹ مل جائے مگر سنگ دل افسر شاہی کہاں کسی کی سنتی ہے۔ سب طرف سے انکار پا کر اس نے آخر کار انجینئرنگ کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا اور اس کے بدلے بی ایس سی میں داخلہ لینے کا فیصلہ کر لیا تا کہ اس کی ماں اکیلی نہ پڑ جائے اور گھر کا خرچہ کفایت شعاری کے ساتھ چلتا رہے۔ بایں ہمہ ماں دلاسہ دیتی رہی کہ آخر وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔

گوتم سپرو نے سری پرتاپ کالج میں بی ایس سی (نان میڈیکل) کے فرسٹ ائیر میں داخلہ لیا جہاں اسے طبیعات، کیمیات، ریاضیات اور انگریزی مضامین کا انتخاب کرنا پڑا۔ باوجودیکہ دل میں تلاطم تھا پھر بھی وہ تعلیم کی طرف انہماک سے جُٹ گیا۔ گھر کی مالی حالت دیکھ کر

اس نے ٹیوشن پڑھانا شروع کر دیا۔ گھر کے نزدیک ہی آٹھویں اور نویں جماعت کے دو تین طالب علم ملے سو اس نے غنیمت سمجھ لیا۔

کالج میں اس کا میتھس لکچرار اس کی قابلیت سے بہت متاثر ہوا۔ اس کے ذاتی حالات جان کر اسے بہت افسوس ہو رہا تھا۔ دریں اثنا اس کو ایک رفیق کار نے اطلاع دی کہ ایک سرکاری افسر کے یہاں نجی طور پر پڑھانے والے ایک معلّم کی ضرورت ہے۔ اس کی بیٹی کانونٹ میں نویں کلاس میں تعلیم پا رہی ہے، اگر ممکن ہو تو کوئی اچھا سا ٹیوٹر تجویز کر لو۔

"ارے یار، لگتا ہے تم نے میرے من کی بات بھانپ لی۔ میری کلاس میں ایک ضرورت مند طالب علم ہے جس کا والد گزر چکا ہے۔ لڑکا بہت شریف، ذہین اور ہونہار ہے مگر اس کی مالی حالت کچھ خراب سی ہے۔ اس کی بہت مدد ہو جائے گی۔"

"بھئی یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ تم اس سے بات کر لو، اگر مانتا ہے تو اس ایڈریس پر کل شام چھ بجے بھیج دو۔ وہاں میرا حوالہ دینا کافی ہوگا۔" اس نے ایک کاغذ پر ایڈریس لکھ دیا اور نیچے اپنا نام لکھ کر پرچہ اس کے حوالے کر دیا۔

میتھس لکچرار نے اس بارے میں وقت گنوانے کے بغیر گوتم سپرو سے بات کی اور اس کی رضامندی پا کر اسے وہ کاغذ سپرد کر دیا جس میں افسر کے گھر کا ایڈریس لکھا ہوا تھا۔

دوسرے روز کالج ختم ہونے کے بعد گوتم کچھ دیر کے لیے کافی ہاؤس میں کافی پیتا رہا اور پھر عین وقت پر جواہر نگر کی طرف اپنی سائیکل دوڑائی۔ وہاں لڑکی کے والد منیر مِلک اس کا انتظار کر رہے تھے۔ گوتم سپرو نے اپنا تعارف پیش کیا۔ لڑکی کی والدہ شیریں ملک نے کچھ دیر کے بعد چائے کی ٹرے لا کر سامنے رکھ دی۔ چائے پیتے پیتے گوتم نے اپنے بارے میں مزید جانکاری دی۔ منیر مِلک نے بھی اپنی پریشانی کی وضاحت کی۔ "میں کئی برسوں سے دہلی میں ریاستی سرکار کے دفتر میں تعینات تھا۔ میری ساری فیملی اُس ماحول میں گھل مل گئی تھی۔ آپ کو شاید معلوم ہوگا کہ دہلی کا تعلیمی معیار باقی ریاستوں سے کہیں بہتر ہے۔ میری بیٹی مہک وہاں ایک بہت ہی اچھے

اسکول میں تعلیم پا رہی تھی۔ لیکن کچھ مہینے پہلے میرا پرموشن وٹرانسفر سرینگر ہوا اور مجھے فیملی لے کر یہاں آنا پڑا۔ یہاں تعلیم کا معیار دیکھ کر مجھے کافی تشویش ہو رہی ہے۔ اس کا میتھس سبجکٹ خاص طور پر کمزور ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ اچھے نمبرات لے کر پاس ہو جائے اور آگے جا کر بارہویں میں میڈیکل سیٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکے۔''

''سر، مجھ سے جتنا ہو سکے گا میں کوشش کرلوں گا۔ میتھس میں اسے چنتا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ باقی مضامین میں بھی اس کو امتحان کے لیے تیار کرلوں گا۔''

''تنخواہ کی آپ فکر نہ کریں۔ آپ کو معقول محنتانہ مل جائے گا۔'' منیر ملِک نے مسکراتے ہوئے کہا۔

گوتم سپرو نے بھی کوئی حجت نہیں کی۔ گھر کا ماحول دیکھ کر وہ کافی متاثر ہوا۔ منیر ملِک اور شیریں ملِک دونوں آزاد خیال اور فراخ دل لگ رہے تھے۔ کہیں کوئی تناؤ نظر نہیں آ رہا تھا۔ والدہ نے چائے ایسے پیش کی جیسے کوئی مہمان نہیں بلکہ گھر کا ہی فرد ہو۔ اس اپنے پن کو دیکھ کر گوتم کو کافی بشاشت ہوئی۔ اس لیے اس نے تنخواہ کی بات کرنا مناسب نہ سمجھا اور فیصلہ منیر ملِک پر ہی چھوڑ دیا۔

دوسرے دن سے گوتم سپرو مہک ملِک کو پڑھانے کے لیے روزانہ چھ بجے حاضر ہو جاتا۔ مہک پڑھائی میں کافی دلچسپی لینے لگی اور جو بھی کام اس کو خود سے کرنے کے لیے دیا جاتا وہ کسی حیلہ حوالہ کے بغیر مکمل کرتی۔ نصاب میں کئی سبجکٹس تھے جن کے ساتھ گوتم سپرو انصاف کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ تین سال وہ لگاتار مہک کو پڑھاتا رہا۔ تنخواہ بھی توقع سے قدرے زیادہ ہی مل رہی تھی جس سے اس کے گھر کی مالی حالت میں کچھ سدھار ہوتا رہا۔ ماں بے چاری ان پڑھ تھی اس لیے کوئی ملازمت کرنے کے قابل نہ تھی۔ شوہر کا فیملی پنشن مل رہا تھا اسی پر اکتفا کرتی۔ پھر بھی اس نے چرخے پر پشمینے کی روئی کاتنا شروع کر دیا اور اس طرح آمدنی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ جس صبر وقناعت سے وہ گھر سنبھالتی تھی اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔

مہک نے نویں اور دسویں میں اسکول میں امتیازی پوزیشن حاصل کر لی۔ جو لڑکی میتھس کے نام سے ڈرتی تھی اس نے اسی مضمون میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کر لیے تھے۔ اس معجزے میں اس کے ماسٹر جی کی محنت اور لگن کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ منیر ملِک اور اس کی شریکِ حیات شیریں ملِک بھی نتیجہ دیکھ کر خوشی سے پھولے نہ سمائے۔ دونوں نے اللہ کا شکر ادا کیا اور مخدوم صاحب کی زیارت میں غریبوں میں کھل کر خیرات بانٹ دی۔ اُدھر اسکول میں بھی فارم ٹیچر نے حیرت کا اظہار کیا اور مہک کو خوشی سے گلے لگا لیا۔ گیارہویں میں ہائیر اسکینڈری بورڈ کا امتحان تھا اور اس میں بھی مہک ملِک کا نام میرٹ لسٹ میں دسویں نمبر پر تھا۔ مگر منزل تو ابھی دور تھی۔ اب تو مہک ملِک کو کالج جا کر پری میڈیکل میں داخلہ لینا تھا اور وہاں بھی ایسی ہی کارکردگی کا مظاہرہ کرنا ناگزیر تھا جیسے اس نے گئے برسوں میں کیا تھا۔

(۵)

تین سال کیسے گزر گئے گوتم کو پتہ ہی نہیں چلا۔ وہ اب مہک ملِک کے خاندان کا ایک رکن سا بن گیا تھا۔ اس کو جو بات سب سے اچھی لگی وہ مہک کے والدین کی روشن خیالی اور زندہ دلی تھی۔ انھوں نے گوتم کو کبھی پرایا نہیں سمجھا اور نہ ہی اس سے کاروباری سلوک روا رکھا۔ وہ بھی دل لگا کر مہک کو پڑھاتا تھا اور پڑھاتے پڑھاتے کبھی اپنی گھڑی کی جانب نہیں دیکھتا تھا۔ شیریں ملِک ہر روز اس کے سامنے چائے اور ناشتہ رکھتی۔ ابتدا میں اس نے شرم کے مارے چائے پینے سے انکار کر دیا۔ ''میڈم، میں زیادہ چائے نہیں پیتا۔ آپ میرے لیے تکلیف نہ کیا کریں۔''

''نہیں بیٹے، تم کالج سے سیدھے یہاں چلے آتے ہو۔ صبح سے کچھ کھایا پیا تو ہوگا نہیں۔ ایسا کرنے سے صحت خراب ہو جائے گی۔ چائے ناشتہ ضروری بنتا ہے۔'' شیریں شفقت

بھرے لہجے میں کہہ دیتی اور وہ لاجواب ہو جاتا۔

شیریں ملِک ایک متموّل سکھ خاندان میں پیدا ہوئی تھی۔ بارہ مولہ کے پاس اس کے والد کے کئی میوہ باغات تھے۔ البتہ فیملی سرینگر میں رہتی تھی۔ جن دنوں وہ ویمنز کالج میں پڑھتی تھی شیریں کی سہیلی نے اس کو اپنے بھائی منیر ملِک سے تعارف کرایا اور یہی تعارف ان کے درمیان دوستی کا سبب بن گیا۔ رفتہ رفتہ وہ منیر ملِک کو دل دے بیٹھی۔ چنانچہ سرینگر میں ایس پی کالج اور ویمنز کالج ایک دوسرے کے بالکل نزدیک تھے اس لیے لڑکے لڑکیوں کا اکثر آمنا سامنا ہو جاتا تھا۔ کبھی موقع مل جاتا تو اپنی محبت کا اظہار کر لیتے تھے۔ شادی میں کئی رُکاوٹیں پیدا ہوئیں لیکن دونوں نے سوجھ بوجھ سے کام لیا۔ ان کے والدین نے بھی بات کو طول نہیں دیا اور حالات سے سمجھوتا کر لیا۔ اس طرح مہک کی ماں شیریں کور سے شیریں ملِک بن گئی۔

کشمیر میں بین مذہبی شادیوں کا رواج عام نہیں تھا۔ پھر بھی چند ایک جوڑوں نے جوکھم اٹھا کر آپس میں ازدواجی بندھن قائم کر لیے۔ ایسے رشتے زیادہ تر امیر طبقے میں وقوع پذیر ہو جاتے اور عوام پر اس کا کوئی بالراست اثر نہیں پڑتا تھا۔ امیر طبقے میں زیادہ تر سیاست دانوں، افسر شاہی یا پھر بڑے صنعت کاروں کی اولادیں تھیں جو پبلک اسکولوں میں تعلیم پا کر مغربی کلچر سے کافی متاثر ہو جاتی تھیں اور خود کو لبرل و ترقی یافتہ سمجھنے لگتی تھیں۔ جہاں کہیں کسی جوڑے کو گڑ بڑ ہونے کا اندیشہ ہوتا وہ وادی چھوڑ کر دہلی یا ممبئی کی راہ اختیار کر لیتا جب تک معاملہ رفع دفع ہو جاتا۔

منیر ملِک نے بھی کچھ ایسا ہی کیا۔ اس نے شیریں کور سے شادی کر کے دہلی میں ایک رشتے دار کے ہاں پناہ لی۔ پھر وہیں پر ریاستی ٹریڈ کمشنر کے آفس میں ملازمت حاصل کر لی اور کئی برس وہاں سکونت پذیر رہا۔ پانچ چھ سال بعد اس کا سرینگر تبادلہ ہوا جو اس کو راس نہیں آیا، اس لیے وہاں کچھ ہی برس رہ کر اس نے دوبارہ دہلی آفس ٹرانسفر کروالیا۔ مگر اب تو اس کے پرموشن کا سوال تھا اس لیے وہ سرینگر آنے سے انکار نہ کر سکا۔ آرڈر ملنے کے کچھ ہی دنوں میں اس نے اپنا

بوریا سنبھالا اور سرینگر پہنچ گیا۔ یہاں اس کو جواہر نگر میں سرکاری کوارٹر الاٹ ہوا جہاں وہ فیملی کے ساتھ رہنے لگا۔

منیر ملِک اور شیریں کور کی بین مذہبی شادی کے کئی مثبت نتیجے نکلے۔ گھر کا ماحول آزاد ایتلاف پسند، بے تکلف، غیر پابند اور سیکولر بن گیا۔ مذہبی کٹر پرستی کے لیے یہاں کوئی جگہ نہیں تھی۔ حالانکہ شیریں کور نے اسلام قبول کر لیا تھا تاہم اس نے اپنے مذہب سے مکمل طور پر ناتا نہیں توڑا۔ وہ کبھی کبھار چھٹی پادشاہی گردوارے جاتی تھی۔ امرتسر میں اس نے ایک بار ہرمندر صاحب کے دربار میں بھی حاضری دی۔ اپنے رشتے داروں اور سہیلیوں کے ساتھ معمول کے مطابق علیک سلیک جاری رکھا۔ رشتے دار اس کے پاس آنے میں کوئی جھجھک محسوس نہیں کرتے تھے۔ اس کی بیٹی مہک بھی اسی ماحول میں پلی بڑھی۔ مہک کے لیے دنیا کا سب سے بڑا مذہب انسانیت تھا، اس لیے وہ ڈاکٹر بن کر خدمت خلق کرنا چاہتی تھی۔

(۶)

اِدھر گوتم سپرو کے نتیجے بھی حوصلہ افزا رہے۔ ٹی ڈی سی فرسٹ ائیر میں امتیازی نمبرات لے کر پاس ہو گیا۔ سیکنڈ ائیر کا امتحان کالج ہی میں لیا گیا جبکہ تھرڈ ائیر کا امتحان یونیورسٹی کے زیر اہتمام لیا گیا۔ گوتم نے خوب محنت کی اور اس کا پھل بھی بہت اچھا نکلا۔ یونیورسٹی میرٹ لسٹ میں اس کا تیسرا مقام تھا جبکہ ریاضی میں اس نے پہلا مقام حاصل کیا تھا۔ اس لیے اس نے آگے ریاضی ہی میں پوسٹ گریجویشن کرنے کی ٹھان لی۔

گوتم کی ماں نے اسے اتنا خوش کبھی بھی نہیں دیکھا تھا، وہ اس کی بلائیں لینے لگی اور دوسرے روز نور کے تڑکے تہری اور کلیجی لے کر شارکا دیوی کے مندر ہاری پربت پہنچ گئی۔ اس کا بیٹا اس کے ہمراہ تھا۔ پوجا کرتے وقت جے کشوری کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اسے وہ دن یاد آیا جب گوتم

کا پہلی جماعت میں داخلہ کرایا گیا تھا اور اس روز بھی اسی مندر میں حاضری دی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ آج اس کے پتا جی موجود نہیں تھے۔ سوچنے لگی کہ کتنے سندر سپنے سنجوئے تھے ہم دونوں نے، آج زندہ ہوتے تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے کہ اتنی مصیبتیں جھیل کر بھی اس کا بیٹا کامرانی سے سرفراز ہوا ہے۔ بہر حال جے کشوری نے پوجا ارچنا کی، بھینٹ چڑھا کر مندر میں حاضر عبادت کرنے والوں کو پرساد بانٹ لیا اور باقی ماندہ اپنے ساتھ گھر لے گئی جہاں اسے پڑوسیوں میں تقسیم کر لیا۔

اسی روز گوتم خوشخبری دینے کے لیے منیر ملِک سے ملنے چلا گیا۔ وہ تو ابھی گھر واپس نہیں آئے تھے البتہ شیریں موجود تھی۔ خبر سنتے ہی اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ وہ کچن سے باداموں کی ایک ٹرے بھر کر لائی اور اسے گوتم کے سر پر بطور صدقہ ڈال دیا۔ بعد میں ان باداموں کو غریبوں میں تقسیم کروا دیا۔ چند منٹوں کے بعد وہ چائے اور ناشتہ لے کر آئی اور گوتم کو دعائیں دینے لگی۔ دریں اثنا منیر ملِک بھی گھر لوٹ آئے۔ خبر سن کر وہ بہت خوش ہوئے اور دل کی گہرائیوں سے گوتم کو مبارکباد دینے لگے۔

خوشیوں کے اس ماحول میں منیر ملِک نے سوچا کہ مہک کی آگے کی پڑھائی کے بارے میں ماسٹر جی سے صلاح مشورہ کر لوں۔ شیریں جلدی سے شوہر کے لیے چائے بنا کر لائی اور پھر گفتگو میں شریک ہو گئی۔ منیر ملِک اس بات پر فکر مند تھے کہ بارہویں جماعت یعنی پری میڈیکل مہک کے کیریئر کے لیے سب سے زیادہ اہم اور نازک سال ہے۔ اُس زمانے میں طالب علموں کے پاس انتخاب کے زیادہ آپشن نہیں ہوتے تھے۔ لے دے کے یا تو ڈاکٹری تھی یا پھر انجینئری۔ بہت ہوا تو لڑکے اوورسیری کرنے چلے جاتے۔ لڑکیوں کے لیے صرف ڈاکٹری کا ہی ایک آپشن تھا۔ نہیں ملی تو معلّمی رہ جاتی تھی۔ مہک ڈاکٹر بننے کی شدید خواہش مند تھی۔

''بارہویں میں مہک کے صرف چار مضامین ہوں گے، انگریزی، فزکس، کیمسٹری اور بائیولوجی، پھر اس کے لیے ٹیوشن کا کیا انتظام کر سکتے ہیں؟'' منیر ملِک نے ماسٹر جی سے رائے

مانگی۔

گوتم سپرو نے بڑے اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔ ''جہاں تک انگریزی مضمون کا سوال ہے، مہک کو کسی درس و تدریس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ کانونٹ کی تعلیم یافتہ ہے اور انگلش پر اس کی مضبوط گرفت ہے۔ فزکس اور کیمسٹری کے مضامین امتحان کے لیے میں تیار کرا سکتا ہوں۔ ان مضامین میں پرابلمز حل کرنے کے لیے میتھس کی کافی ضرورت پڑتی ہے۔ اب تو مہک کو میتھس پر بھی کافی عبور ہے۔ مسئلہ صرف بائیولوجی کا رہتا ہے، اس کے بارے میں آپ کو سوچنا پڑے گا۔ یا تو وہ خود ہی بائیولوجی کی تیاری کر سکتی ہے یا پھر کسی ٹیچر کی مدد لینی پڑے گی۔ اس بارے میں مہک سے مشورہ کرنا ضروری ہے۔ باقی جیسے آپ مناسب سمجھیں۔''

''آپ کی تجویز درست ہے۔ ہم مہک سے مشورہ کریں گے اور آگے کیا کرنا ہوگا اس کے بارے میں فیصلہ لیں گے۔ کیا آپ دو تین دن کے بعد یہاں آ سکتے ہیں؟'' شیریں ملک بول پڑی۔

''جی کیوں نہیں۔ آپ اس مسئلے پر غور و خوض کر لیں اور پھر مجھے اپنے فیصلے سے آگاہ کر لیں۔ میں آنے والے اتوار کو حاضر ہو جاؤں گا۔ اب مجھے اجازت دیں۔'' یہ کہہ کر گوتم سپرو وہاں سے رخصت ہوا۔

اس بارے میں والدین نے رات کو ڈائننگ ٹیبل پر مہک سے مشورہ کیا۔ اس نے بھی قریب قریب وہی بات کہی جو ماسٹر جی نے کہی تھی۔ ''پاپا، انگریزی اور بائیولوجی میں مجھے کسی ٹیوٹر کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ یہ دونوں مضامین میں خود ہی تیار کر سکتی ہوں۔ ویسے بھی کوئی طالب علم ان سبجکٹس میں گھر پر ٹیوٹر نہیں رکھتا۔ جہاں تک فزکس اور کیمسٹری کا سوال ہے، گوتم سر نے تو دونوں سبجکٹس میں گریجویشن کیا ہے اور امتیازی نمبرات کے ساتھ کامیاب ہوئے ہیں، مجھے لگتا ہے کہ وہ یہ کام بخوبی سر انجام دے سکتے ہیں۔ ایک تو ان کے پڑھانے کا ڈھنگ اچھا ہے اور دوسرے ان کا میتھس کا بیک گراونڈ ہے جو ان دونوں سبجکٹس میں کافی مددگار ثابت

ہوگا۔"

مہک ماسٹر جی کے پڑھانے سے اتنا مانوس ہو چکی تھی کہ وہ اسے کھونا نہیں چاہتی تھی۔ اسے پورا اعتماد تھا کہ گوتم سر کیمسٹری اور فزکس میں اس کی بہت مدد کر سکتے ہیں۔ ان مضامین میں زیادہ تر پرابلمز حل کرنے کا ڈر لگا رہتا ہے جس کے لیے میتھس کی ضرورت پڑتی ہے اور میتھس میں تو گوتم سپرو مہارت رکھتا تھا۔ اسے پورا یقین تھا کہ وہ میڈیکل کالج میں داخلہ لینے میں کامیاب ہوگی۔ والدین نے اس کی بات سمجھ کر یہی فیصلہ لیا کہ گھر میں گوتم فزکس اور کیمسٹری پڑھائے گا اور باقی مضامین مہک خود ہی تیار کر لے گی۔

پورے سال گوتم سپرو مہک کو دونوں مضامین پڑھاتا رہا۔ وہ ہر نیا سبق پڑھانے سے پہلے خود گھر میں اس کو سمجھنے اور گرفت میں لینے کی کوشش کرتا۔ علاوہ ازیں سبق کے حوالے سے جو پرابلمز حل کرنا مطلوب ہوتیں انھیں پہلے خود حل کر لیتا اور پھر مہک کو سمجھا کر اسے حل کرنا سکھاتا۔ اتنا ہی نہیں وہ بعض اوقات انگریزی خاص کر مضمون نگاری اور تلخیص نگاری میں بھی مدد کرتا اور بائیولوجی میں پریکٹکل نوٹ بک پر مختلف ڈائیگرامز بنا کر دیتا۔ چونکہ مصوری گوتم سپرو کا مشغلہ تھا، اسے تصویریں اور سائنس ڈائیگرامز بنانے میں مزہ آتا تھا۔ مہک اس کی شخصیت کی ہمہ گیریت سے کافی متاثر ہوتی رہی۔ کبھی کبھی اس کے دل میں خیال اٹھتا کہ وہ ماسٹر جی کے سامنے گھنٹوں بیٹھی رہے اور وہ اس کا پورٹریٹ بنا لے۔ ایک عجیب سی الفت تھی جو وہ اپنے لبوں تک نہیں لا سکتی تھی۔ استاد ہونے کا کچھ تو لحاظ کرنا پڑتا تھا۔

(۷)

گوتم سپرو کو پوسٹ گریجویشن کے لیے روزانہ کشمیر یونیورسٹی جانا پڑتا تھا۔ یونیورسٹی کیمپس کم اور باغِ اِرم زیادہ لگتا تھا۔ افق تا افق نیلے اودے پہاڑوں سے گھرے ہوئے خواب

آور مناظر، چاروں طرف پھیلی ہوئی ہریالی اور سیبوں کے باغات، ایک طرف گیٹ سے نکلتے ہی ڈل جھیل کا نظارہ اور دوسری طرف حضرت بل کی مقدس درگاہ جہاں پیغمبر اسلامؐ کا موئے مبارک رکھا ہوا تھا۔ ڈل جھیل کے کنارے ایک جانب شنکر آچاریہ کا مندر تھا اور دوسری جانب ہاری پربت کا قلعہ۔ ہاری پربت کی اپنی ایک الگ اہمیت تھی۔ یہ پربت مذہبی رواداری کا علامیہ تھا۔ قلّہ کوہ پر مغلوں کے زمانے کا ایک قلعہ تھا جو اب ویراں پڑا تھا۔ ہاری پربت کے ارد گرد ایک اونچی دیوار تھی جس کے کئی دروازے تھے۔ پہاڑی پر ایک طرف شارکا دیوی کا چکری شوری مندر تھا اور دوسری طرف مخدوم صاحب کی زیارت۔ کاٹھی دروازے سے نکلتے ہی سکھوں کا گردوارہ چھٹی پادشاہی تھا۔ پہاڑی کے دامن میں گنیش جی کا مندر تھا جہاں ہندو سب سے پہلے حاضری دیتے، پھر چکری شوری کے مندر جا کر لوٹ آتے اور آخر میں پہاڑی کے ارد گرد طواف کرتے۔ چکر لگاتے سمئے راستے میں کئی اور مندر بھی نظر آتے تھے جہاں عقیدت مند متھا ٹیکتے۔

یونیورسٹی کی معطر فضاؤں میں بیمار بھی صحتیاب ہو جاتے۔ اس کی دونوں طرف انجینئرنگ کالج کے دو وِنگ تھے۔ کیمپس کے مرکز میں ایڈمنسٹریشن بلاک تھا جبکہ سامنے آرٹس کا بلاک تھا۔ سائنس مضامین کے مختلف بلاک ایک دوسرے سے کافی دور تھے۔ شعبۂ نباتات کے نزدیک ایک خوبصورت بوٹینکل گارڈن بھی تھا جہاں مختلف قسموں کے پھول اور پودے کیمپس کی زینت بڑھا رہے تھے۔ فرصت کے اوقات میں طلبہ اِدھر اُدھر گھومتے پھرتے نظر آتے، کبھی کسی جماعت کا فری پیریڈ ہوتا اور کبھی کسی اور جماعت کا۔ اِدھر کچھ طلبہ بیڈمنٹن کھیلتے نظر آتے جبکہ اُدھر کچھ اور طلبہ کرکٹ کھیلتے دکھائی دیتے۔ خوشگوار موسم میں لڑکیاں ٹولیاں بنا کر سیب کے درختوں کے نیچے بیٹھ جاتیں اور میٹھی میٹھی دھوپ کا مزہ لیتیں۔

بہر حال گوتم سپرو کی قسمت میں یہ سب عیاشیاں کہاں تھیں۔ وہ بے چارہ تو صبح سویرے ناشتہ کر کے اپنی سائیکل پر گھر سے نکل جاتا، ایکسچینج روڈ پر دو ٹیوشن پڑھاتا اور اپنی سائیکل وہیں چھوڑ جاتا۔ پھر تار گھر کے پاس یونیورسٹی کی گاڑی پکڑ لیتا۔ دن بھر یونیورسٹی میں مختلف

لکچراروں کی تقاریر سن لیتا۔ اپنا لنچ ڈبّے میں ساتھ لے جاتا اور فرصت کے وقت زہر مار کرتا۔ شام کو بس سے پھر ایکسچینج روڈ پر اترتا جہاں سے وہ اپنی سائیکل لے کر جواہر نگر ٹیوشن کرنے چلا جاتا۔ دیر رات وہ واپس گھر پہنچ جاتا۔

ماں کو بیٹے کی اس محنت و جانفشانی پر بہت ترس آتا تھا۔ اس کا بس چلتا تو بیٹے کو اپنا کلیجا کھلاتی مگر مجبور تھی، اس کا شوہر اسے منجھدار میں چھوڑ کر راہِ عدم اختیار کر گیا تھا۔ بیٹے کو دیکھ کر وہ آٹھ آٹھ آنسو روتی۔ جے کشوری نے گوتم کے بارے میں نہ جانے کتنے خواب سجائے تھے۔ دو بیٹیوں کو جنم دے کر منتیں ماننے کے بعد ایک بیٹا پیدا ہوا تھا، سوچتی تھی کہ اسے انجینئر بناؤں گی۔ گوتم کے والد کے کئی شاگرد اس کے سامنے انجینئر بن گئے تھے۔ وہ جب بھی اپنے استاد کو دیکھتے تو پاؤں چھو کر اس کی آشیرباد لیتے۔ لیکن اپنے بیٹے کے وقت قسمت نے ایسی پلٹی کھائی کہ جے کشوری کف افسوس ملتی رہی۔ اس کے سپنے بلوریں فانوس کی مانند عین موقعے پر گر کر چکنا چور ہو گئے۔ اس کا بیٹا امتیازی نمبرات حاصل کرنے کے باوجود ٹریننگ کرنے نہیں جا سکا۔ جے کشوری کے من میں بار بار خیال آتا کہ کاش اس کا پتی ایک لحظے کے لیے آجاتا اور خود اپنی آنکھوں سے دیکھتا کہ زندگی میں دولت کی کتنی اہمیت ہوتی ہے، اگر اس نے ٹیوشن کر کے سرمایہ جمع کیا ہوتا تو آج گوتم کو ٹریننگ کرنے میں مشکلیں نہیں آتیں۔ تاہم وہ ان خیالات کا اظہار کسی دوسرے کے سامنے نہیں کرتی اور ہمیشہ اپنے آنجہانی شوہر کی عزت و احترام کرتی۔

(۸)

مہک ملِک عجیب سی الجھن میں پھنس گئی۔ وہ اپنے دل کی بات ماسٹر جی کے سامنے ظاہر نہیں کر پا رہی تھی۔ ایک جانب وہ ماسٹر جی کی تقدیس و تحریم کرتی تو دوسری جانب اس کو جان سے بھی زیادہ چاہنے لگی۔ اس کے لیے ہمت جُٹا پانا مشکل ہو رہا تھا۔ کبھی خیال آتا کہ خط لکھ کر اس

کے بیگ میں رکھ دوں اور کبھی سوچتی کہ اسے کسی ریسٹورانٹ میں ملنے کی دعوت دوں۔ بے شمار خط لکھے اور پھر پھاڑ ڈالے کیونکہ انھیں منزل تک پہنچانے کی کوئی سبیل نہیں سوجھ رہی تھی۔ گو دونوں کی عمر میں زیادہ فرق نہیں تھا پھر بھی استاد اور شاگرد کا رشتہ سدِ راہ بن رہا تھا۔ اس رشتے کو پھلانگنے کے اس نے کئی جتن کیے لیکن ناکام رہی۔

اُدھر مہک ملک کی پھوپھی کی نظریں بچپن ہی سے اس پر جمی تھیں۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کی شادی اپنے بیٹے خالد بٹ سے کر دے۔ اس نے اپنی بھابی سے کئی بار اس کا ذکر کیا مگر ہمیشہ روکھا سا جواب مل جاتا کہ وقت آنے پر میں مہک کے والد سے بات کرلوں گی۔ دوسری طرف والد تھے کہ کسی کی سننے کے لیے تیار نہ تھے، وہ اپنی بیٹی کو ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ کچھ پیشے عورتوں کی شخصیت کو خوب نکھارتے ہیں۔ عورت انسانیت کا پیکر ہوتی ہے۔ جس پیشے میں خدمت خلق ہو وہ عورت کا زیور بن جاتا ہے۔ ڈاکٹری کو وہ ایک عظیم پیشہ سمجھتے تھے۔ انھوں نے خالد کے بارے میں سنا تو تھا کہ اس کی ماں مہک میں دلچسپی رکھتی ہے مگر ہمیشہ رفت گزشت کرتے۔

خالد بٹ دیکھنے میں بہت خوبصورت تھا، کسرتی بدن کا مالک اور فیشن ایبل، مگر اس کی ایک بڑی کمزوری تھی اور وہ تھی اس کی تعلیم۔ وہ بہت جتن کر کے بھی بارہویں سے آگے تعلیم حاصل نہیں کر سکا اور نہ ہی اس نے ایسا کرنے کی ضرورت سمجھی۔ اس کا باپ عبدالقادر بٹ جنگلات کا ٹھیکیدار تھا، سرکار کی آنکھوں میں دھول جھونک کر دونوں ہاتھوں سے روپیہ لوٹ لیتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ آزادی کے بعد جمہوری نظام میں جنگلات کا صفایا ہو گیا۔ نہ کوئی پوچھنے والا اور نہ ہی کوئی حساب رکھنے والا۔ عبدالقادر بٹ کو بھی خالد کی تعلیم میں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کا بیٹا بھی اس کے ساتھ مل کر کام کرے۔ وہ فخر سے کہتا تھا کہ پڑھے لکھے لوگ یا تو کلرک بن جاتے ہیں یا پھر افسر اور دونوں چند روپیوں کی خاطر میرے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہیں۔ کئی بار تو اس نے الیکشن میں امیدوار بننے کی بھی کوشش کی مگر ہر بار ناکام رہا۔ کشمیر کی سیاست میں امیدواروں

کی کامیابی اس بات پر منحصر ہوتی ہے کہ وہ برسر اقتدار پارٹی کے ساتھ منسلک ہو۔ بہر حال عبدالقادر بٹ نے سیاسی ریس میں اکثر صحیح گھوڑے پر داؤ لگایا۔

اس کے باوجود عبدالقادر نے کسی سیاست دان سے رشتہ منقطع نہیں کیا۔ غور سے دیکھا جائے تو اکثر سیاست دانوں نے آپس میں رشتے جوڑے تھے حالانکہ ظاہراً وہ مخالف سیاسی پارٹیوں کے رکن تھے۔ کوئی آزادی کی باتیں کر رہا تھا، کوئی رائے شماری کا مطالبہ کر رہا تھا، کوئی پاکستان سے ایک ہی میز پر بیٹھ کر کشمیر کے مسئلے کو سلجھانے کی تجویز پیش کر رہا تھا اور کوئی اقتدار کی کرسی پر بیٹھ کر مرکز سے زیادہ سے زیادہ سرمایہ لاکر ریاست میں خرچ کرنے کو اپنا مقصد سمجھ رہا تھا گو وہ سرمایہ غریبوں کے پاس کم اور گنے چنے دوست احباب کے پاس زیادہ پہنچ رہا تھا۔ انجام کار جمہوری نظام میں نئے امراوجود میں آئے جو اپنے نام کے آگے سید یا حاجی لگا کر اپنا وقار بڑھانے میں مصروف تھے۔ مگر مقامی لوگ انھیں طنزاً 'چرس خوجہ' کے نام سے یاد کرتے تھے۔ کمیونسٹ نظریے سے وابستہ چند رہنما بنیادی تبدیلیاں لانے کے کوشاں تھے مگر نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔ بدلے ہوئے حالات کی وجہ سے وہ ناکام رہے اور انھیں بھی آخرش بہتی گنگا میں ہاتھ دھونا پڑا۔

جب پھوپھی کو معلوم ہوا کہ مہک ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرنے میں دلچسپی رکھتی ہے تو اس کے پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی۔ اپنے بیٹے سے موازنہ کر کے وہ پریشان ہوگئی۔ اس لیے سوچا کہ ایک بار بھاوج سے بات کرنے میں ہرج ہی کیا ہے۔

'' دیکھو بھابی، میں کب سے اس انتظار میں بیٹھی ہوں کہ مہک کو اپنے گھر کی بہو بنا کر لے آؤں۔''

'' مجھے معلوم ہے۔ میری بھی یہ چاہت تھی کہ خالد اور مہک کی آپس میں شادی ہو۔ دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہیں، ایک دوسرے کی طبیعت سے واقف ہیں اور پھر دونوں گھرانوں میں آپسی رشتہ بھی ہے مگر اس بارے میں میں کچھ بھی نہیں کرسکتی۔''

''بھلا کیوں؟''

''مہک کے والد اسے ڈاکٹر بنانا چاہتے ہیں اور وہ اس بارے میں کسی کی کچھ بھی سننا پسند نہیں کرتے۔''

''بھابی، کیوں اپنی بیٹی کو غلط راستے پر ڈال رہی ہو۔ حیا اور حجاب عورت کے زیور ہوتے ہیں۔ پڑھی لکھی لڑکیاں گھر گرہستی کے قابل نہیں رہتیں۔ پھر خالد تو بارہویں سے آگے تعلیم حاصل کرنے والا نہیں۔ اگر مہک ڈاکٹر بن گئی تو کیا وہ خالد سے شادی کرلے گی؟''

''یہی بات میں نے بھی تمھارے بھائی سے کی تھی مگر وہ بولے کہ اس کا فیصلہ تو تب ہی ہوگا جب مہک ڈاکٹر بن جائے گی، اس سے پہلے اس بارے میں سوچنا ہی فضول ہے۔ اب تم ہی بتاؤ کہ میں کیا کروں؟''

ٹکا سا جواب پا کر پھوپھی اندر ہی اندر بھسم ہوگئی مگر چہرے پر جذبات ظاہر نہیں ہونے دیے۔ جب واپس گھر چلی گئی تو سارا ماجرا اپنے خاوند کو سنایا۔ وہ خود کو بہت بڑا آدمی سمجھتا تھا۔ اس کی انا کو کافی ٹھیس لگی۔ کہنے لگا۔ ''اس ٹکے کے سرکاری نوکر کا تو دماغ ہی پھر گیا ہے۔ خود بھی اپنی برادری سے باہر شادی کرلی اور اب....! کیوں خواہ مخواہ کی مغز ماری کرتی ہو۔ اگر انھیں مرضی نہیں ہے تو نہ سہی، اس شہر میں کونسی لڑکیوں کی قحط پڑی ہے۔ ہم صاحبِ ثروت ہیں، کوئی کنگال تو نہیں۔ خالد کے نصیب میں جو ہوگی وہ دوڑی چلی آئے گی۔ فکر کیوں کرتی ہو۔''

پھوپھی اپنا سا منہ لے کے رہ گئی۔ مگر خالد نے جب اپنی ماں سے شیریں ملک کا فیصلہ سن لیا تو آگ بگولا ہوگیا۔ اسے احساس کم تری نے جکڑ لیا۔ ردِ عمل میں وہ چاہنے لگا کہ کسی نہ کسی طریقے سے اس کا بدلہ لے۔ انسان کو فطرتاً انکار پر جو گہرا صدمہ پہنچتا ہے وہ برداشت سے باہر ہوتا ہے۔

ایک روز مہک ملک اپنی سہیلیوں کے ساتھ کالج سے نکل کر گھر کی طرف جا رہی تھی کہ اس کے سامنے ایک رائیل اینفیلڈ موٹر سائیکل رُک گئی۔ وہ گھبرا گئی، دیکھا تو سامنے خالد بٹ کھڑا تھا۔ کچھ تسلی سی ہوئی مگر پھر بھی دل میں وسوسے پیدا ہوگئے۔ خالد نے اسے مخاطب ہو کر کہا:

''مہک، مجھے تم سے اکیلے میں کچھ بات کرنی ہے۔''

''مگر مجھے تو تم سے کوئی بات نہیں کرنی ہے۔''

''کیوں؟''

''ہمارے درمیان کوئی ایسا مسئلہ تو ہے نہیں جس پر باہمی گفتگو درکار ہے اور وہ بھی یہاں اس سڑک پر۔''

''مہک، یہ کون ہے؟'' ایک سہیلی ان کی بات کاٹ کر پوچھ بیٹھی۔

''میرا کزن ہے۔'' مہک نے جواب دیا۔

''بڑا ہینڈسم ہے۔ جا کر بات کرلو، بات کرنے میں کیا حرج ہے۔'' سہیلی نے کہا۔

''بات کرنی ہو تو گھر میں آ کر کرے، یہاں سڑک پر کیا بات ہو سکتی ہے۔''

''ارے جاؤ بھی، ہم انتظار کریں گے۔''

سہیلیوں کے اصرار پر وہ خالد کے ساتھ سڑک کے کنارے چلی گئی۔

خالد نے اسے مخاطب ہو کر کہا۔ ''میری ماں تمہارے گھر شادی کا پیغام لے کر گئی تھی، میں نے سنا کہ تم لوگوں نے اسے ٹھکرایا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟''

''مجھے اس بارے میں کوئی علم نہیں ہے۔ یہ بات والدین کے درمیان ہوئی ہوگی، مجھ سے نہ تو کسی نے پوچھا اور نہ میں نے کسی کو جواب دیا۔ رہی بات میری، میں ابھی پڑھنا چاہتی ہوں اور شادی کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں۔ جب مناسب وقت آئے گا تو اس بات پر سوچوں گی۔'' وہ خالد کو مجروح کر کے چلی گئی اور اپنی سہیلیوں کے ساتھ گھر کی جانب روانہ ہوگئی۔

مہک ملک نے شام کے وقت ساری بات اپنے والدین کو بتادی۔ ماں نے کوشش کی کہ بات ہلکے انداز میں رفع دفع ہو جائے کیونکہ منیر احمد کی بہن کے لڑکے کا معاملہ تھا۔ وہ اس مسئلے کو طول نہیں دینا چاہتی تھی۔ لیکن باپ نے سنجیدگی سے اس بات کا نوٹس لیا۔ اس نے اپنی بہن سے خود بات کرنے کی ٹھان لی کیونکہ دونوں خاندانوں کے درمیان رشتہ بگڑنے کا اندیشہ تھا۔

(۹)

اس سال جاڑوں میں کچھ زیادہ ہی سردی پڑی۔ وادی میں زمستان عجیب سی صورتیں بنا کر آتا ہے، پہلے چِلّہ بچہ، پھر چلّہ کلاں اور آخر میں چلّہ خورد۔ مارچ کے مہینے میں موسم سرما دم توڑنے لگتا ہے، برف پگھلنے لگتی ہے اور سردی کی شدت جستہ جستہ کم ہو جاتی ہے۔ بید کے درختوں پر خوبصورت کونپلیں نکلتی ہیں، خودرو سفید اور پیلے نرگس کے پھول زمین سے پھوٹ کر بہار کے نقیب بن جاتے ہیں اور کچھ دنوں کے بعد بادام کے پیڑوں پر شگوفے پھوٹنے لگتے ہیں۔ ہوا میں عجیب سی تازگی پھیل جاتی ہے۔ سارا ماحول جیسے نیند سے بیدار ہو جاتا ہے اور لوگوں کی زندگی میں دوبارہ گہما گہمی عود کر آتی ہے۔

اپریل کے آتے آتے ہاری پربت کے دامن میں چہار سو باداموں کے شگوفے نظر آتے ہیں۔ ہواؤں کے جھونکوں سے پھولوں کی نرم و نازک پتیاں ہر دم گرتی رہتی ہیں گویا کہ عرش سے پھول برس رہے ہوں اور فرش پر سفید پتیوں کی چادر بچھ رہی ہو۔ کشمیری ہندوؤں کے نئے سال 'نوریہہ' سے شروع ہو کر نوروز، بیساکھی اور ہر اتوار کو یہاں 'بادام واری' کا میلہ لگتا ہے اور ہندو، مسلم اور سکھ سبھی لوگ جوق در جوق آ کر دن بھر موج مستیاں کرتے ہیں جب تک شگوفوں کا موسم ختم نہیں ہوتا اور پھول بادام کی شکل اختیار نہیں کرتے۔ بہت ہی خوشنما سماں ہوتا ہے۔

لوگ اپنے بال بچوں کو لے کر خوشیاں منانے یہاں چلے آتے ہیں، بادام کے پیڑوں کے نیچے چھوٹی چھوٹی دریاں بچھا دیتے ہیں اور اگر بھیڑ کی وجہ سے وہاں جگہ نہیں ملتی ہے تو کھلے سر سبز میدان پر کھیس پھیلا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ کھانے پینے کی چیزوں، سنگھاڑوں، کھلونوں اور سستے کپڑوں کی دکانیں لگ جاتی ہیں۔ اس عریض میدان میں اندر آنے کے لیے کئی سڑکیں آتی ہیں جن پر دو رویہ دکانیں سج جاتی ہیں اور ان پر کھانے پینے کا سامان ملتا ہے، بچوں کے کھلونے ملتے

ہیں اور پھر زرق برق کرتی چھینٹیں اور رنگ برنگ کی چوڑیاں دستیاب ہوتی ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ چاروں اطراف سے آوازیں آ آ کر کانوں سے ٹکراتی تھیں: ''ہر مال ملے گا ساڑھے چھ چھ آنے''۔ نہ جانے یہ ساڑھے چھ آنے ہی کیوں چنا گیا تھا، پورے چھ یا سات کیوں نہیں؟ دکانوں پر بھیڑ لگی رہتی ہے اور یہ نظارہ قابل دید ہوتا ہے۔

سماواروں میں نمکین چائے ابلتی رہتی ہے اور پیالوں کی کھنک سے ماحول پُر جوش ہو جاتا ہے۔ بازار سے لُچیاں اور کمل ککڑی کے پکوڑے (ندر منجی) خرید کر چائے کے ساتھ کھائے جاتے ہیں۔ جہاں دیکھو وہاں بچے، بوڑھے اور جوان سنگھاڑوں کی چھال اتار کر انھیں کھانے میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔ جہاں تہاں بچے کھیلتے نظر آتے ہیں، ہاتھوں میں مختلف سائز اور شکل کے غبارے لیے یا چکری گھماتے ہوئے یا پانی کی گیندوں کو اچھالتے ہوئے یا پھر رنگ برنگی روئی جیسی مٹھائی کینڈی کھاتے ہوئے۔ ان کی لیے یہ میلے عید سے کم نہیں ہوتے۔

ہر سو دلکش مناظر دیکھ کر دل شگفتہ ہو جاتا۔ مسکراتے چہرے، کُلیلیں کرتی ہوئیں الھڑ اور شوخ دوشیزائیں، شریر اور من موجی نوجوان جو حسیناؤں کو دیکھ کر اپنی آنکھیں سینکتے رہتے۔ دور کسی ٹرانزسٹر سے کسی فلم کا گانا سنائی دیتا..... ''آوارہ ہوں، آوارہ ہوں، گھر بار نہیں، سنسار نہیں مجھ سے کسی کو پیار نہیں۔'' یا پھر ''بہارو پھول برساؤ، میرا محبوب آیا ہے۔'' کوئی مجنون کسی حسینہ کو دیکھ کر پھبتیاں کستا اور مسکراہٹیں بکھیرتا۔ دوسری جانب کوئی منچلا کسی دوشیزہ کے سامنے کچھ فاصلے پر بیٹھ کر اس کو متاثر کرنے کے لیے ایکٹروں کے انداز میں سگریٹ کے کش لگاتا اور منہ سے مرغولے پھینکنے کی کوشش کرتا۔ سبھی اپنی اپنی دنیا میں گم نظر آتے۔ بے چارے حساس والدین اپنی بیٹیوں پر کڑی نگاہ رکھ کر ہوشیار و محتاط رہتے۔

گوتم سپرو اپنی ماں، بڑی بہن اور اس کے بچوں کے ساتھ نیا سال منانے بادام واری آیا تھا۔ سوچا چلو کچھ تو تفریح کا سامان ہوگا۔ گوتم یوں بھی بہت سنجیدہ رہتا ہے اور زیادہ باتیں کرنے کا عادی نہیں۔ اس کی ماں نے ایک بادام کے پیڑ کے نیچے چادر ڈال دی اور سبھی اس پر بیٹھ

گئے۔ ہوا کے جھکوروں سے بادام کے پیڑ سے پھولوں کی سفید پتیاں گر رہی تھیں۔ گوتم ایک طرف بیٹھ کر آئن رینڈ کا انگریزی ناول 'فونٹین ہیڈ' پڑھنے لگا۔ کچھ وقفے کے بعد بچے آس پاس کھیلنے لگے جبکہ ماں نے سماوار میں کوئلے ڈال کر اسے گرمانے کی کوشش کی تاکہ شیر (نمکین) چائے بنا سکے۔ داماد نے ڈھیر سارے سنگھاڑے خرید کر لائے جن کے مغز اس کی بیوی نکال کر سامنے جمع کر رہی تھی۔ چائے تیار ہونے سے قبل گوتم نے بازار سے لُچیاں اور ندر منجی خرید لیں اور ماں کے سامنے رکھ دیں۔ اچانک دور سے مہک ملِک کی نظر گوتم پر پڑی اور وہ شتابی اس کی طرف دوڑ کر آئی۔ دور سے ہی اس نے زور سے چلّایا۔ ''ہائے سر، گڈ مارننگ! آپ اور یہاں....سرپرائزنگ! یہ کتابیں تو آپ کو یہاں بھی نہیں چھوڑیں گی۔''

مہک ملِک کے والدین کی نگاہیں بھی گوتم سپرو پر پڑیں، انھوں نے بھی پاس آ کر گوتم اور اس کی فیملی کو ہیلو کہہ دیا۔ گوتم چوکنا ہو گیا۔ فوراً کتاب کو فرش پر رکھ کر کھڑا ہوا اور منیر ملِک سے مصافحہ کر کے اس کو اور اس کی بیوی کو اپنی ماں، بہن اور بہنوئی سے تعارف کرایا۔ ماں نے جلدی سے ایک اور چادر نکال کر سبزے پر ڈال دی اور تینوں کو اس پر بیٹھنے کے لیے استدعا کی۔ ''آپ یہاں بیٹھ جائیے، تھوڑی دیر میں چائے تیار ہوگی تب تک کچھ سنگھاڑے کھا لیجیے۔''

منیر ملِک موٹر کار میں یوں ہی تفریحاً کسی تیاری کے بغیر بال بچوں کو لے کر نکل پڑا تھا اور غیر شعوری طور پر یہاں پہنچ گیا۔ سوچا تھا کہ تھوڑا بہت گھوم گھام کر اور بازار سے کچھ چائے ناشتہ نوش کر کے لوٹ آئیں گے۔ یہاں آ کر اسے احساس ہوا کہ انھیں بھی کچھ سماوار وغیرہ لے کر آنا چاہیے تھا۔ خیر تینوں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے۔ جے کشوری نے ڈھیر سارے سنگھاڑے سامنے رکھ دیے اور بیٹی کو کہا کہ ان کے چھلکے اتار کر سامنے پلیٹ پر رکھ دو۔ مہک نے اس سے چاقو چھیننے کی کوشش کی مگر جے کشوری نے منع کر دیا۔ ''نہیں بیٹی، یہ کام تمھارا نہیں ہے، غلطی سے چاقو ہاتھ میں لگ گیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔''

کچھ دیر میں چائے بھی تیار ہو گئی اور سبھی لوگ لُچّی اور ندر مُنجی کے ساتھ شیر چائے پینے

لگے۔ چائے بہت مزے دار تھی۔ اس میں دودھ اور ملائی کے علاوہ بادام، الائچی وغیرہ بھی ڈالے گئے تھے۔ منیر ملِک اور شیریں بس دیکھتے ہی رہ گئے۔ جے کشوری کی انکساری، خلوص اور خوش خلقی سے وہ بہت متاثر ہوئے۔ گوتم سپرو یوں بھی کم گو تھا اس لیے زیادہ باتیں نہیں کر پایا حالانکہ مہک نے کئی بار اس کو پھسلا کر بحث میں شریک کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ آخر کار چائے ناشتہ نوش فرما کر منیر ملِک اور شیریں نے شکریہ ادا کر کے رخصت لی اور گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

راستے بھر وہ ان کے بارے میں باتیں کرتے رہے جبکہ مہک فقط سنتی رہی اور مسکراتی رہی۔

(۱۰)

یونیورسٹی کا وہ ایک سال بڑی سست رفتاری سے گزرا۔ کچھ کر دکھانے کا جذبہ اور نتیجے کا بے صبری سے انتظار وقت کو طول دیتا ہے۔ ہر لمحہ ایک ایک گھڑی کے برابر لگتا ہے۔ یہی حال مہک کا تھا۔ اس کے سامنے زندگی کا ایک ہی مقصد تھا اور وہ تھا ڈاکٹر بننے کا۔ کبھی کبھار وہ پریشاں ہو جاتی کہ اگر اتفاق سے کوئی چوک ہو گئی تو پھر اس کا کیا ہوگا۔ اپنے اس وسوسے کا ذکر اس نے کئی بار ماسٹر جی سے بھی کیا لیکن بدلے میں اس نے خود پر بھروسہ رکھنے کی تلقین کی۔ وہ ہر بار اس کی ہمت بندھاتا۔ گوتم سپرو اسے سمجھاتا رہتا کہ اس میں اپنی منزل پانے کی صلاحیت بھی ہے اور قابلیت بھی، صرف اپنی ذات پر بھروسے اور اعتماد کی ضرورت ہے۔ اسے منفی خیالات کو کبھی پاس پھٹکنے نہیں دینا چاہیے۔ گوتم اس کو طبیعات اور کیمیات کے مضامین میں تندہی سے رہنمائی کرتا رہا۔ حالانکہ وہ خود گریجویشن میں ان مضامین میں امتیازی نمبرات لے کر کامیاب ہوا تھا پھر بھی وہ کوئی جوکھم اٹھانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ ہر روز گھر سے نیا سبق اور اس سے جڑی پرابلمز تیار کر کے آتا اور مہک کو حتی الوسع سمجھانے کی کوشش کرتا۔ مہک بھی خوب تعاون کرتی اور اپنی جانب سے بہت محنت کرتی۔ انگریزی مضمون میں اسے کسی کی مدد کی ضرورت نہ تھی تاہم جب کبھی کہیں اٹک جاتی

تو گوتم سپرو سے رہنمائی حاصل کرتی ۔ مسئلہ صرف علم حیاتیات کا تھا، جس میں نہ گھر پر کسی کی رہنمائی حاصل کرسکتی تھی اور نہ ٹیوٹر کچھ مدد کرسکتا تھا۔ اس لیے وہ کالج میں دل لگا کر علم نباتات اور علم حیوانیات کے لکچر سنتی ، باضابطہ نوٹس بناتی اور کہیں کوئی بات سمجھ نہ آتی تو متعلقہ لکچرر سے وضاحت حاصل کرتی ۔ اس مضمون میں بھی گوتم سپرو اس کو ڈائیگرامز (اشکال) بنانے میں رہنمائی کرتا ۔ وہ کسی بھی پیچیدہ شکل کی جزئیات کو پہلے خود سمجھنے کی کوشش کرتا اور پھر آسان طریقے سے مہک کو سمجھا دیتا تا کہ اسے صحیح طریقے سے شکل بنانے میں کوئی مشکل نہ ہو۔

آخر کار مہک ملِک کے امتحانات کا ڈیٹ شیٹ شائع ہوا۔ وہ گھبرا رہی تھی مگر گوتم سپرو اس کی پیٹھ ٹھونکتا رہا اور خود اعتمادی کھونے سے اس کو بچاتا رہا۔ ایک ایک پرچے کا امتحان مکمل ہو جاتا اور ایک ایک مرحلہ طے ہو جاتا۔ وہ جونہی کالج سے گھر آتی تو بے صبری سے ماسٹر جی کا انتظار کرتی تا کہ اس کو اس روز کی حصولیابی کے بارے میں سب کچھ بتلا دے۔ اسے اتنا تو بھروسہ تھا کہ اس نے امتحان میں اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے پھر بھی تسلی تب ہی ہوتی جب شام کو گوتم سپرو اس کے گھر پہنچ جاتا، اس کی کارکردگی کو آنکتا اور اس کو دلاسہ دیتا کہ اس نے یقیناً امتیازی نمبر لائے ہیں۔ اس طرح دن بیتتے رہے، پرچے ہوتے رہے اور پھر سارا امتحان ختم ہو گیا۔

مہک ملِک خوش ہونے کے بجائے رفتہ رفتہ غم زدہ ہو رہی تھی۔ پوچھنے پر کوئی جواب نہ دیتی ۔ اس کو اس بات کا غم کھائے جا رہا تھا کہ اب اس کی ملاقات اس کے مثالی معبود سے نہیں ہو سکے گی۔ وہ اسے مستقل طور پر الوداع نہیں کہنا چاہتی تھی ۔ وہ گوتم کو بہت چاہنے لگی تھی اور اس نے اشاروں اشاروں میں گوتم کے سامنے اظہار بھی کیا مگر وہ جان بوجھ کر ٹال جاتا۔ اس کی حیثیت اور وفاداری مانع بن جاتی۔ وہ اتنے برسوں کے خوشگوار رشتے کو تناؤ میں بدلنا نہیں چاہتا تھا۔ البتہ مہک کی اس صنم پرستی کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

گوتم سپرو جونہی مہک ملِک کو پڑھانے سے فارغ ہوا تو اپنی تعلیم پر توجہ مرکوز کی۔ حالانکہ پڑھائی میں اس نے کبھی کوئی کوتاہی نہیں برتی ، بلا ناغہ کلاسز میں حاضر رہتا اور ہر پروفیسر کی

بات غور سے سننے اور سمجھنے کی کوشش کرتا پھر بھی امتحان کے لیے جس تیاری کی ضرورت ہوتی ہے اسے شک ہو رہا تھا کہ کہیں کوئی کمی رہ گئی ہے۔ اس لیے وہ باقی ماندہ دنوں سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ ایم اے میتھس کا فرسٹ ائیر تھا اور امتحانات سر پر آ چکے تھے۔ اسے نہ دن کی خبر رہتی اور نہ رات کی۔ رات کو پڑھنے کی عادت تو شروع ہی سے تھی، اس لیے دیوار گیری کا بھی انتظام کیا تھا کیونکہ بجلی ٹامک ٹوئیے مارتی تھی۔ اس نے اپنے بیڈ کے ساتھ میز پر اسٹوو اور چھوٹا سا پتیلا بھی رکھا تھا تاکہ نیند کو بھگانے کے لیے رات میں دو تین بار اسی پر چائے بنا کر پی سکے۔ ماں نے کئی بار تنبیہ کی کہ ایسا کرنے سے تمھاری صحت خراب ہو جائے گی مگر وہ کہاں مانتا۔ آخر کار یومِ مقررہ آ ہی گیا۔ صبح اٹھ کر اس نے ہر روز کی طرح اپنی پیاری ماں کی صورت دیکھ لی کیونکہ یہ اس کا وشواس بھی تھا اور توہم بھی کہ ایسا کرنے سے اس کا دن اچھا گزر جائے گا۔ پھر نہا دھو کر اور ماں کا آشیرواد لے کر یونیورسٹی چلا گیا۔ شام کو آتے ہی پہلے اپنی ماں کو امتحان میں پرچہ کیسا ہوا کی خبر سنا دی۔ یہ سلسلہ تب تک یوں ہی چلتا رہا جب تک آخری پرچے کا امتحان ختم نہ ہوا۔

دو مہینے بعد پہلے مہک ملِک کا نتیجہ آیا۔ والد نے دفتر کے کسی ملازم کو گزٹ سے نتیجہ دیکھنے کے لیے بھیج دیا۔ واپسی پر اس نے مژدہ سنایا۔ منیر ملِک کو اپنے کانوں پر یقین ہی نہ ہوا۔ اس کی بیٹی کو میرٹ لسٹ میں دسواں نمبر تھا۔ وہ دفتر سے جلدی نکل کر اور بازار سے مٹھائی کے چند ڈبے خرید کر فوراً گھر پہنچا مگر اسے حیرانی ہوئی کہ وہاں ماسٹر جی نے پہلے ہی مہک کا رزلٹ دریافت کر کے خبر دی تھی۔ سارے گھر میں خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔ منیر ملِک نے مٹھائی کا ایک ڈبّہ ماسٹر جی کو دے دیا اور باقی گھر پر مہمانوں کے لیے رکھ دیے۔

تقریباً ایک مہینے کے بعد گوتم سپرو کا نتیجہ بھی آیا۔ اس کا نام یونیورسٹی کے میرٹ لسٹ میں تیسرے نمبر پر تھا۔ یہ تو ظاہر سی بات تھی کہ اس کو میتھس میں کوئی پچھاڑ نہیں سکتا تھا۔ امید تھی کہ اس کا نام پہلے نمبر پر ہوگا پھر ایسا کیسے ہوا؟ بات دراصل یوں تھی کہ اس نے اپنی ساری توجہ مہک کی پڑھائی پر دی تھی جس کے باعث اپنی تیاری میں کچھ کوتاہی رہ گئی۔ خیر ابھی تو ایم اے کا فائنل ائیر

باقی تھااور وہ اس خامی کو دور کر سکتا تھا۔ وہ اپنے نتیجے کے بارے میں خبر دینے کے لیے مہک کے یہاں چلا گیااور اس کے والدین نے خوب ساری دعائیں دیں۔

ایک اور مرحلہ طے کرنا باقی تھا۔ وہ یہ کہ مہک کو کس میڈیکل کالج میں داخلہ کرایا جائے۔ چنانچہ ان لوگوں نے دہلی میں کئی سال گزارے تھے اور وہاں کے ماحول سے خوب واقف تھے اس لیے مہک نے آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنس میں داخلہ لینے کو ترجیح دی اور اس میں وہ کامیاب بھی رہی۔ گوتم بھی یہ سن کر بہت خوش ہوااور وہ مبارکباد دینے کے لیے اس کے گھر پہنچ گیا۔ منیر ملِک خود ہی اپنی بیٹی کو میڈیکل کالج میں چھوڑنے اور اس کے ہوسٹل کا انتظام کرانے کے لیے چلا گیااور اس کو اچھی طرح سے سیٹل کر کے واپس آ گیا۔

(۱۱)

اُدھر ایم اے فائنل ائیر میں گوتم سپرو نے بہت محنت کی اور امتحان میں پہلی پوزیشن حاصل کر لی۔ وہ خوشی سے پھولے نہیں سمایا۔ اس کی ماں بھی بہت خوش ہوگئی کہ چلو زندگی نے دھوکا دے دیا مگر بیٹے نے تو لاج رکھی۔ گھر آ کر جب گوتم نے اسے یہ مژدہ سنایا تو اس نے بیٹے کی بلائیں لیں اور، جیسے کہ اس نے منّت مانی تھی، دوسری صبح ہاری پربت کے چکری شوری مندر میں تہری اور کلیجی کا بھوگ چڑھایا۔ اس بار ساتھ میں بھیڑ کا ایک پورا پھیپھڑا بھی لے گئی تھی جو ماں بیٹے دونوں نے ٹکڑے ٹکڑے کر کے آسمان پر منڈلاتی ہوئی چیلوں کو کھلایا۔ گھر لوٹتے سمئے گوتم سوچنے لگا کہ کاش مہک سرینگر میں ہوتی تو وہ کسی بہانے سے اس کے گھر چلا جاتا اور اس کو یہ خوشخبری دیتا۔ مگر اب تو وہاں جانے کا کوئی جواز ہی نہ تھا۔

کہتے ہیں جہاں چاہ وہاں راہ۔ مہک نے اپنے ذرائع سے گوتم کا رزلٹ معلوم کرا لیا اور سنتے ہی نہال ہوگئی۔ اس کی شادمانی کی کوئی حد نہ رہی۔ اس نے جلدی سے قلم اٹھایا اور گوتم

کو خط لکھنے بیٹھ گئی۔ ابتدا میں کچھ ہچکچاہٹ ہو رہی تھی اور کچھ گھبراہٹ بھی، بالآخر دل دماغ پر حاوی ہو گیا اور اس کا قلم قرطاس پر دوڑنے لگا۔ اِس سے بہتر موقع پھر کہاں مل سکتا تھا۔

آداب!!

سمجھ نہیں آتا کہ آپ کو کس طرح مخاطب کروں۔ ڈیئر لکھوں؟.... سر لکھوں؟.... یا پھر فارمل طریقے سے نام لکھوں! ایک طرف میرے استاد محترم ہیں، دوسری طرف میرے ہمدرد ہیں جنھوں نے اپنی ساری مصروفیات چھوڑ کر مجھے یہاں تک پہنچا دیا اور تیسری طرف میرے ہم جلیس ہیں جن کی میں پوجا کرتی ہوں۔ مجھے امید ہے کہ آپ میری اس بے باکی سے ناراض نہیں ہوں گے اور اگر مجھ سے کوئی گستاخی ہو جائے تو معاف کریں گے۔

کچھ دیر پہلے میں نے آپ کا رزلٹ معلوم کرایا، آپ نے تو مجھے اطلاع دینے کی کوئی کوشش نہیں کی حالانکہ میں انتظار کر رہی تھی۔ کم سے کم اتنا تو کر سکتے تھے کہ گھر میں ڈیڈی یا ممی سے مل آتے تو وہ مجھے ٹیلیفون پر بتا دیتے۔ خیر جیسے آپ کی مرضی۔ آپ کو فرسٹ پوزیشن مل گئی ہے، اس کے لیے میرے دل کی گہرائیوں سے مبارک باد قبول کریں۔ آپ کی ذہانت پر مجھے کبھی رتی بھر بھی شبہ نہیں تھا لیکن جن جان گداز حالات کے ساتھ آپ نوعمری میں جوجھتے رہے ان کے بارے میں سوچ کر ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ تعلیم کے دوران پتا جی کا گزر جانا، گھر میں کوئی سہارا نہ ہونا، طالب علمی کے زمانے میں ٹیوشن کر کے گزر بسر کرنا اور اپنی تعلیم بدستور جاری رکھنا — یہ آپ جیسا اولوالعزم اور حوصلہ مند نوجوان ہی کر سکتا ہے، کوئی اور ہوتا تو کب کے ہاتھ کھڑے کر دیے ہوتے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ میں اتنے برسوں سے آپ کے پاس زیر تعلیم رہی، میں نے آپ کے چہرے پر کبھی مایوسی یا شکستہ پائی کی کوئی شکن نہیں دیکھی۔ آپ کی یہی بات مجھ سب سے زیادہ بھاتی ہے۔

مجھے وہ دن یاد آ رہا ہے جب آپ پہلی بار ہمارے گھر تشریف لائے تھے۔ سترہ اٹھارہ برس کا شرمیلا، کم گو اور خوش اخلاق نوجوان ...! ممی ڈیڈی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ اتنی صغر سنی میں آپ

مجھے پڑھا سکیں گے۔ پھر بھی انھوں نے جو کھم اٹھایا مگر آپ نے ایک ہی سال میں کرامات دکھائیں۔ ابو کو میری میتھس کی ترقی اور قابلیت پر تعجب ہوا۔ کہاں تو وہ آپ کو عمر کے لحاظ سے نامنظور کرنے جارہے تھے اور کہاں انھیں آپ کے ساتھ بے پناہ لگاؤ ہو گیا۔ کل کالج میں آپ کی کامیابی پر اپنی سہیلیوں کو گرینڈ پارٹی دے رہی ہوں، کوئی پوچھے گی تو بس یہی بتاؤں گی آج میرے قریبی دوست نے ایم اے میتھس میں پہلی پوزیشن حاصل کی ہے۔ نام پوچھیں گے تو خاموش رہوں گی۔

اگر ممکن ہو تو میری ایک بات مان لیں۔ آپ دہلی شفٹ کرلیں اور یہیں پر نوکری کے لیے دوڑ دھوپ کرلیں۔ یہ بہت بڑا شہر ہے اور یہاں نوکری ملنے کے امکانات بھی زیادہ ہیں۔ کچھ وقفے تک آپ کو اپنے خرچے پر گزارا کرنا پڑے گا جب تک کہیں نوکری مل جائے گی۔ یہاں بیشتر سرکاری فلیٹوں کے مکین ایک کمرہ سب لیٹ کرتے ہیں اور کرایہ بھی واجبی لیتے ہیں۔ چاہیں تو میں کسی مقامی سہیلی کی وساطت سے کمرے کی تلاش کرسکتی ہوں۔ نوکری لگنے کے بعد آپ اپنی والدہ کو بھی ساتھ میں رکھ سکتے ہیں اور اپنا گھر بار بسا سکتے ہیں۔ میں خود بھی ایم بی بی ایس کرنے کے بعد یہیں پر سیٹل ہونے کی سوچ رہی ہوں۔

مجھے نہیں معلوم میں نے اوپر کیا کچھ لکھ ڈالا مگر جو کچھ بھی لکھا وہ میرے دل کی آواز ہے جو میرے اندر کئی برسوں سے دبی پڑی تھی۔ اس لیے میں خط لکھ کر اسے دوبارہ نہیں پڑھوں گی۔ باقی میں آپ پر چھوڑ دوں گی، آپ چاہیں تو مجھے اپنی دوست سمجھ کر جواب دیں یا پھر ایک بھولی بھٹکی اسٹوڈنٹ سمجھ کر معاف کردیں۔ میری طرف سے والدہ کو سلام کہہ دیں۔

نیک خواہشات کے ساتھ — آپ کی شاگرد

مہک ملِک

گوتم سپرو کو جب مہک ملِک کا خط ملا تو اس کی نگاہیں خیرہ ہوگئیں۔ اتنا تو اس کو اندازہ تھا کہ مہک اس کو اپنا آئیڈیل مانتی ہے اور اسی کے نقش قدم پر چلنا چاہتی ہے مگر بات یہاں تک پہنچے گی اس کا اسے مطلق گماں نہ تھا۔ اس نے خط پڑھا، کئی بار پڑھا، اس کی ایک ایک سطر کو غور سے

پڑھتا رہا۔ پھر اپنے سرہانے کے نیچے رکھ کر لیٹنے کی کوشش کی۔ اسے احساس تھا کہ ایسی صورت حال میں جلد بازی اچھی نہیں ہوتی۔ اس لیے سوچا کہ خوب غور وفکر کر کے ہی مہک کو جواب دینے کے بارے میں فیصلہ کرلوں گا۔ خط رات بھر وہیں تکیے کے نیچے پڑا رہا مگر وہ کچھ بھی طے نہیں کر پا رہا تھا۔ کوئی اور بات ہوتی تو ماں یا کسی دوست سے مشورہ کر لیتا مگر یہ تو بات ہی کچھ نرالی تھی، ہونٹوں پر لانے سے بھی ڈر لگ رہا تھا۔

(۱۲)

رات بھر وہ اس مسئلے پر سوچتا رہا۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اسے یاد آیا کہ کئی برس پہلے بین مذہبی شادی پر وادی میں بہت بڑا ہنگامہ برپا ہوا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ کشمیر میں اس سے پہلے کبھی بین مذہبی شادیاں نہیں ہوئی تھیں مگر مذکورہ شادی کی نوعیت کچھ مختلف تھی یا پھر یوں کہیے کہ اس پر فرقہ وارانہ رنگ چڑھا دیا گیا۔ اس سے پہلے جتنی بھی شادیاں ہوئی تھیں، ان میں سے کوئی لڑکی پنڈت تھی، کوئی سکھ تھی اور کوئی مسلمان۔ چنانچہ سبھی امیر طبقے سے تعلق رکھتی تھیں اور خود کفیل تھیں، اس لیے کسی نے انگلی اٹھانے کی جرأت نہیں کی۔ خود مہک کی ماں سکھ قوم سے تعلق رکھتی تھی جبکہ اس کا والد مسلمان تھا۔ اس پر طرّہ یہ کہ سیاست دانوں نے اپنے بچوں کی ایسی حرکتوں کو سیکولرازم کی مثال بنا کر پیش کیا اور اس طرح اپنی کشادہ دلی اور بے تعصبی کا ثبوت دیا۔ لیکن محولا بالا واقعہ کے وقت لڑکی کوآپریٹو محکمے میں ادنیٰ سی ملازم تھی اور اس نے اپنے ہی محکمے کے سینئر ملازم سے ازدواجی بندھن باندھا تھا۔ ایک فرقہ کہتا تھا کہ وہ مجبور کر دی گئی جبکہ دوسرا فرقہ کہتا تھا کہ اس نے اپنی مرضی سے شادی کی۔ سچ تو اوپر والا ہی جانتا تھا۔ کشمیری پنڈتوں نے اس واقعے پر ایجی ٹیشن کی اور یہ جتانے کی کوشش کی کہ ان کی لڑکیاں غیر محفوظ ہیں اور ان کا زبردستی استحصال ہو رہا ہے۔ جیسا کہ سیکولر ہندوستان میں پس آزادی ہوتا آیا ہے یہ احتجاج اقلیتی عدم تحفظ کا علامیہ

بن کر رہ گیا۔ ایجی ٹیشن بہت دنوں تک جاری رہی اور کشمیری پنڈت پہلی بار سڑکوں پر اتر آئے۔ جلسے جلوس منعقد ہوئے، ستیہ گرہ کیے گئے، نوجوانوں نے رضامندی سے خود کو پولیس کے حوالے کر دیا، ریگل چوک میں احتجاج کرنے والوں پر تیزاب پھینکا گیا حبہ کدل میں پولیس نے جلوس پر گولیاں چلائیں جس میں کئی لوگ شہید ہوگئے، پائیں علاقے سے مخالف فرقے کے لوگ حملہ کرنے کی غرض سے جلوس کی صورت میں حبہ کدل تک آگئے اور راستے میں کئی دکانوں کو لوٹ لیا۔ ایک طرف پولیس نے کشمیری پنڈت لیڈروں کو جیلوں میں قید کر دیا اور عقوبت دے کر ان کو ایجی ٹیشن سے کنارہ کرنے کی نصیحت دی تو دوسری طرف پنڈت فرقے کے افراد کو جگہ جگہ سے اٹھا کر حوالات میں بند کر دیا اور انھیں انسانیت سوز اذیتیں پہنچائیں۔ احتجاجی رہنما تو پہلے اس بات پر مصر تھے کہ اغوا شدہ لڑکی کو واپس کیا جائے کیونکہ شادی اس کی مرضی کے خلاف زبردستی کی گئی تھی پھر رفتہ رفتہ ان کے مطالبے بڑھتے گئے اور آپس میں گڈ مڈ ہوتے چلے گئے۔ نئے مطالبات میں سرکاری نوکریوں میں منصفانہ حصہ داری اور پیشہ ورانہ کالجوں میں میرٹ کی بنیاد پر داخلہ شاملِ فہرست کیے گئے۔ ریاستی سرکار نے اپنی پارٹی کے ایک پنڈت مرکزی وزیر کو ثالث کے طور پر میدان میں اتار دیا جس نے قائم مقام کشمیری پنڈت لیڈروں سے بات چیت کر کے ان کو شیشے میں اُتار دیا اور ایجی ٹیشن ختم کروا دی۔ احتجاجی غبارے کی ہوا پھُس کر کے نکل گئی اور کشمیری پنڈتوں کی کمر ٹوٹ گئی۔

دوسرے روز بھی گوتم چھٹپٹاتا رہا۔ مہک نے اس کو جو دعوت دی تھی اس میں کسی کی بھلائی نہ تھی۔ ظاہراً اس کے جذبات منطق پر غالب آچکے تھے۔ لگتا تھا کہ مہک نے وقتی طور پر سوچ وفکر کے سب دروازے بند کر دیے ہیں۔ ان دو کے بیچ پیار کا بندھن ناممکن تھا اور اگر وہ ایسا کر بھی لیتے تو بڑا جوکھم اٹھانا پڑتا۔ خیر رات میں اس نے سوچ سمجھ کر جواب دے ہی دیا۔

ڈئیر مہک!

سب سے پہلے میں اس بات کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ وہاں رہ کر بھی تمھیں میرے

امتحان کے نتیجے کی فکر رہی۔ خدا کی مہربانی سے اس سال مجھے اپنی محنت کا متوقع پھل مل گیا اور پہلی پوزیشن حاصل ہوئی۔ یہ سب میری ماں اور تمھاری دعاؤں کا نتیجہ ہے۔ میری دلی خواہش تھی کہ میں میتھس میں پوسٹ گریجویشن کرلوں کیونکہ مجھے اس مضمون سے بڑا اُنس ہے حالانکہ فزکس اور کیمسٹری میں ملازمت کے زیادہ امکانات ہیں۔

جہاں تک میرے دہلی میں سیٹل ہونے کا سوال ہے یہ ناممکن ہے۔ میری ماں بالکل نہیں مانے گی۔ وہ مجھے ایک گھڑی بھی اپنے سے دور رہنے کی اجازت نہیں دے گی۔ دنیا میں اس کا ایک ہی سہارا ہے اور وہ میں ہوں۔ پھر سوچ لو کہ میں اس ماں کو، جس نے اپنی زندگی مجھ پر قربان کی، کیسے اکیلا چھوڑ سکتا ہوں۔

اب میں اصلی مدعا پر آتا ہوں۔ مہک، میں تمھیں بہت پسند کرتا ہوں مگر میں نے تمھیں کبھی بھی اس روپ میں نہیں دیکھا جس میں تم میرے سامنے آنا چاہتی ہو۔ ہمارے درمیان استاد اور شاگرد کا متبرک رشتہ رہا ہے اور اسی رشتے سے میں تمھیں ہمیشہ دیکھتا رہا ہوں۔ پھر تمھیں اپنی محبوبہ کے روپ میں کیسے تسلیم کرلوں۔ تم ایک اسپیشلسٹ ڈاکٹر بننے والی ہو۔ تمھاری اُڑان کے لیے کئی سارے آسماں اور بھی ہیں جبکہ منزل کا اندازہ اس وقت لگانا مشکل ہے۔ ابھی تو تم نے کیریئر کی شروعات کی ہے۔ میری دلی خواہش ہے کہ تم آگے ایم ڈی کرلو اور بہت بڑی اسپیشلسٹ بن جاؤ۔ تمھارے لیے بڑے بڑے ڈاکٹروں کے پیغامات آئیں گے۔ تمھارے والدین اس دن کا انتظار کررہے ہوں گے کہ کب بٹیا ڈاکٹری کی ٹریننگ مکمل کرلے اور اپنا گھر بسائے۔ ان کی امیدوں پر تم پانی مت پھیرو۔ یہ میری درخواست ہے۔ ہمارے اس رشتے کے بارے میں جان کر انھیں بہت بڑا صدمہ ہوگا اور میں ان کو کوئی صدمہ نہیں پہنچانا چاہتا۔ میری دعا ہے کہ تم اپنے پیشے میں بہت بڑا نام پیدا کرلو اور اپنی خوشبو سے غریبوں اور بے سہارا لوگوں کے گھر معطر کرلو۔

نیک خواہشات کے ساتھ — تمھارا خیر اندیش

گوتم سپرو

انہی دنوں ریاستی سرکار نے بے روزگار نوجوانوں سے درخواستیں طلب کر لیں اور تعلیمی ڈگری کے حساب سے ان کی لسٹ بنوائی ۔ایم اے وایم ایس سی ڈگری یافتہ بے روزگاروں کو ماہانہ ڈھائی سو روپے کے وظیفے پر اسکولوں میں بطور مشاہرہ دار استاد تقرری کی گئی جن کا آگے جاکر مستقل ہونے کا امکان تھا۔ گوتم سپرو نے بھی فارم بھر دیا اور دو تین مہینے بعد اس کی تقرری ہوگئی ۔ وہ بہت ہی خوش تھا کہ چلو زیادہ دن بے روزگاری نہیں دیکھنی پڑی ۔اس کی تقرری پاس ہی ایک گاؤں میں ہوئی جو سرینگر سے پندرہ کلومیٹر کی دوری پر تھا۔اس کے علاوہ وہ بدستور صبح وشام ٹیوشن پڑھانے جاتا تھا اور اپنی کمائی ماں کے ہاتھ میں سونپ دیتا تھا۔ ماں بھی کافی حد تک سنبھل گئی۔

معلّمی گوتم سپرو کے لیے صرف پیشہ ہی نہیں تھا بلکہ ایک عبادت تھی ۔ گو وہ بھی اپنے والد کی طرح مثالیت پسند تھا مگر ٹیوشن کرنا اس کی مجبوری تھی ۔محض ڈھائی سو روپے میں کیسے گزارہ کرسکتا تھا۔ کبھی کبھی وہ سوچ کے اتھاہ سمندر میں ڈوب جاتا۔ غربت کی وجہ سے اس نے زندگی میں بہت کچھ کھویا تھا۔اس نے دوسرے لوگوں کی طرح نہ بچپن میں شرارتیں کیں، نہ لڑکپن میں مٹر گشتیاں کیں اور نہ ہی جوانی میں نظر بازیاں کیں ۔ بچپن میں والد کی عینیت پسندی اور قناعت پسندی آڑے آئی اور جوانی میں ابھی قدم رکھا ہی تھا کہ پتاجی کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور گھر کی ساری ذمہ داریاں اس کے سر پر آگئیں ۔ ذمہ داریوں کا ہجوم ہر باشعور انسان کو وقت سے پہلے ہی بوڑھا کر دیتا ہے ۔ گوتم سپرو بھی اس فہرست میں شامل تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ کم گو، متین اور فکر مند بن گیا۔ صبح سویرے مرغ کی بانگ کے ساتھ جاگ اٹھتا ، دن بھر کلاس میں حاضری دیتا اور شام کو ٹیوشن کے لیے سائیکل پر یہ جا وہ جا۔ پھر رات گئے گھر آجاتا اور دیوار گیری کے نیچے آدھی رات تک مطالعہ کرتا۔

گوتم سپرو نے تین سال یونہی وظیفے پر گزارے ۔ آخر کار ریاستی سرکار نے سبھی وظیفہ خوار استادوں کو مستقل کر دیا اور انھیں ریگولر استادوں کی تنخواہیں دینے لگے ۔انجام کار گوتم سپرو

کی مالی حالت سدھرتی گئی اور وہ اب اپنے بارے میں مزید سوچنے لگا۔ اُدھر مہک کے خطوط آنے کا سلسلہ جاری رہا۔ وہ مہینے میں ایک دو خط لکھ ہی دیتی تھی چاہے گوتم کا جواب ملتا یا نہ ملتا۔ گوتم کو تعجب ہورہا تھا کہ ایک ہونہار درخشاں مستقبل والی لڑکی جو ڈاکٹر بننے والی ہے اس کو ایک معمولی استاد میں کیا دلچسپی ہوسکتی ہے؟ یہ فلرٹیشن تو ہو نہیں سکتی کیونکہ مہک کے خطوط سے سنجیدگی ٹپک رہی تھی۔ کل کو وہ سماج کے سامنے کیا منہ لے کر جائے گی یہ اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ کبھی وہ جواب دیتا اور اپنے جذبات کی عکاسی کرتا اور کبھی مہک کو زمینی حقیقت سے آشنا کرنے کی کوشش کرتا۔ کبھی وہ مہک کو تنبیہ کرتا کہ وہ غلط راستہ اپنا رہی ہے اور اس راستے پر دونوں کی بربادی یقینی ہے اور کبھی قسمت پر یہ سوچ کر سب کچھ چھوڑ دیتا کہ اوپر والے نے جو کچھ اس کی تقدیر میں لکھا ہوگا وہ ہوکر رہے گا۔

مہک ملِک ان تین برسوں میں بہت میچور ہوگئی تھی۔ اپنا برا بھلا سوچنے کی تمیز رکھتی تھی۔ مگر نہ جانے کیوں اس معاملے میں وہ دماغ کے بدلے دل سے کام لے رہی تھی۔ اس نے گوتم سپرو کو صاف صاف لکھ دیا کہ وہ یا تو شادی اس سے کرے گی یا پھر زندگی کے ارفع مقاصد کے حصول کے لیے اکیلی جیے گی۔ بقول مہک شادی دو ہم خیال روحوں کا ملن ہے اور اس کی زندگی میں شادی کی اہمیت صرف اتنی ہے کہ شریک ازدواج ایک دوسرے کی مثبت خواہشات کی تکمیل کریں نہ کہ ایک دوسرے کے لیے سدِ راہ بن جائیں۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ اگر اس کو اپنی مرضی کا شریکِ حیات نہیں ملا تو وہ کنواری ہی رہے گی اور انسانی فلاح و بہبود کے لیے زندگی بسر کرے گی۔

ٹریننگ کے دوران اس کی کارکردگی بہت عمدہ رہی۔ اساتذہ و دیگر طلبہ اس کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس نے نسوانی امراض اور فنِ جنائی میں مہارت حاصل کرنے کی ٹھان لی اور اس حوالے سے بہت محنت کرتی رہی۔ جب کبھی فرصت کے لمحات میسر ہوتے تو ادب کا مطالعہ کرتی جس میں وہ سوانح حیات کو زیادہ پسند کرتی۔ فلورنس نائٹ انگیل، مدر ٹریسا، اینی بیسنٹ،

میری کیوری، ہیلن کیلر، مارسیا باربوسا، وانگاری مارتھائی، مریم مرزا خانی، کیتھرین جونسن، کیارا نرگن وغیرہ جیسی شخصیات نے اس کو مسحور کر دیا۔ وہ خود بھی ان کے نقش قدم پر چلنا چاہتی تھی۔ اس بارے میں خطوط میں اس نے کئی بار ذکر کیا۔ دوسری جانب جب کبھی وہ اپنی سہیلیوں کو اپنے پیار کے بارے میں بتاتی تو وہ اس کا مذاق اڑاتیں کیونکہ ان کی سمجھ سے یہ بالاتر تھا کہ اتنی ذہین ڈاکٹر جس کا مستقبل بہت روشن ہے کیوں کر ایک معمولی استاد کے پیچھے پاگل ہو رہی ہے۔ اس نے نہ تو اپنے محبوب کا نام ظاہر کیا اور نہ اس کی آئیڈینٹٹی افشا کی۔ وہ سہیلیوں کے طنز کو نظر انداز کرتی رہی۔ اس نے تو گوتم کو دل سے چاہا تھا اور اس کی پرستش کرتی تھی، اس لیے اس کے بغیر اور کسی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

(۱۳)

مہک ملِک کے والدین پہلے ہی دہلی سے واقف تھے اس لیے موسم سرما کے دوران کچھ دنوں کے لیے یہاں آکر رہتے تھے۔ انھوں نے یہاں لاجپت نگر میں ایک چھوٹا سا فلیٹ خرید لیا تھا جو باقی دنوں خالی رہتا تھا۔ ہاں جب سے مہک دہلی آئی تھی، شیریں سردیوں میں یہیں قیام کرنے لگی۔ منیر ملِک کو دربار موو کے باعث جموں میں رہنا پڑتا تھا تاہم پوجا کے دنوں میں یا پھر چھٹیاں لے کر وہ بھی دہلی چلا آتا۔ عام طور پر مہک گھر میں ماں کے ساتھ ویک اینڈ بِتاتی تھی اور باقی دنوں اسے ہوسٹل میں رہنا پڑتا تھا۔ والدین بھی کبھی کبھار ہوسٹل میں آکے اس سے ملتے تھے۔ ماں باپ اس کی ترقی سے بہت خوش تھے۔ اکلوتی اولاد تھی، اسی سے ساری امیدیں لگا رکھی تھیں۔ جب آدمی اپنے خوابوں کی تعبیر دیکھتا ہے تو من ہی من میں کھل اٹھتا ہے۔ اب تو قریباً تین سال رہ گئے تھے مہک کے ڈاکٹر بننے میں، ماں اس کے بارے میں سوچا کرتی کہ پڑھائی ختم ہونے کے بعد وہ واپس گھر آجائے گی، کسی ہسپتال میں

نوکری کرے گی، پھر کسی ڈاکٹر کو اپنا ہمسفر چُن لے گی اور دونوں ایک ساتھ کوئی چھوٹا سا کلینِک کھولیں گے۔

متوسط طبقے کے چھوٹے موٹے ارمان...! ماں تو بہت کچھ سوچتی تھی مگر اس کو کیا معلوم تھا کہ مہک نے اپنے بارے میں کچھ اور ہی سوچ رکھا ہے۔

جنوری کا مہینہ تھا۔ ہوا میں کچھ خنکی تھی۔ اتوار ہونے کے سبب سارا کنبہ لال قلعہ، جامع مسجد اور گاندھی و نہرو کی سمادھیاں دیکھنے چلا گیا۔ پہلے لال قلعے کی سیر کی جو شاہ جہاں نے تب بنوایا تھا جب اس نے سلطنت کا دارالخلافہ آگرہ سے دہلی تبدیل کیا۔ دیوان عام، دیوان خاص، ممتاز محل، رنگ محل، خاص محل، موتی مسجد۔ اور بھی نہ جانے کون کون سے نام لیے تھے گائیڈ نے۔ منیر ملک قیاس کرنے لگا کہ جب دہلی میں شہنشاہ ہوا کرتا تھا ان دنوں یہاں کیسی رونق ہوتی ہوگی۔ لال قلعے کے بعد سبھی افراد شاہ جہاں کی ہی تعمیر کرائی ہوئی جامع مسجد دیکھنے چلے گئے جو ہندوستان کی بڑی مسجدوں میں سے ایک ہے اور جس میں پچیس ہزار سے زیادہ لوگ نماز پڑھ سکتے ہیں۔ ان تعمیروں کی خصوصیت یہ ہے کہ دونوں سرخ سنگِ ریگ سے بنی ہوئی ہیں۔ یہ سرخ پتھر دہلی کی عمارتوں کی پہچان بن چکا ہے۔

مسجد سے نکل کر وہ بھیڑ بھاڑ والے علاقے چاندنی چوک پہنچ گئے، گھنٹہ گھر کے پاس ریسٹورانٹ میں چھولے بھٹورے کھا لیے، پھر گردوارہ سیس گنج دیکھ لیا جہاں شیریں نے تھوڑی دیر عبادت کی۔ وہاں سے ٹیکسی لے کر گاندھی، نہرو، شاستری اور اندرا گاندھی کی سمادھیاں دیکھنے چلے گئے۔ اس کے بعد واپس اپنے گھر کا رخ کر لیا۔

پورا دن سیر و تفریح میں گزر گیا تھا۔ سب کے سب تھک کر چور ہو گئے تھے۔ آتے ہی خود کو بھاری بھرکم بوریوں کی مانند اپنے بستروں پر پھینک دیا۔ شیریں کو کھانا بنانے کا موڈ ہی نہیں تھا، اس لیے پاس ہی ایک ریسٹورانٹ سے ڈنر منگوایا اور ملتے ہی سب اس پر ٹوٹ پڑے۔

کھانا کھا کر ماں کی نیند نہ جانے کہاں غائب ہو گئی۔ کافی دیر تک اپنی بیٹی کے کمرے

میں بیٹھی رہی اور اس سے بتیاتی رہی۔ بہت ہچکچاہٹ کے بعد آخر اس کے منہ سے وہ بات نکل ہی گئی جس کو کہنے کے لیے وہ بہت دنوں سے بے قرار تھی۔

''مہک بیٹی، اب تو تمھاری پڑھائی میں بہت کم وقت رہا۔ تین سال زیادہ ٹائم نہیں ہوتا ہے۔ پھر اتنا وقت تو اچھا بَر ڈھونڈنے میں لگ ہی جاتا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تمھارے لیے کوئی موافق لڑکا ڈھونڈ لوں۔ تمھارے ڈیڈی کہہ رہے تھے کہ اس سے دریافت کرلو کہ کوئی لڑکا اس کی نظر میں ہو تو بتادے ورنہ ہم تلاش کرلیں گے۔''

مہک اس تجویز کے لیے تیار نہ تھی۔ وہ حیرت میں پڑ گئی۔ کچھ وقفے کے لیے فکرمند ہوگئی کہ کیا جواب دے۔ گوتم کے بارے میں بتانا تو بعید القیاس تھا جبکہ کسی اور کے بارے میں وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس لیے اس کے لب سِلے رہے۔ کچھ دیر کے بعد ماں نے پھر استفسار کیا۔

''کیوں بیٹی، تم نے جواب نہیں دیا، کوئی لڑکا ہو تو بتادو۔''

مہک نے ہمت کر کے جواب دیا۔ ''ماں، میں نے اس بارے میں سوچا ہی نہیں۔ ابھی تو میں شادی کرنا نہیں چاہتی۔ ابھی قریباً تین سال ایم بی بی ایس مکمل کرنے میں لگ جائیں گے۔ پھر دیکھتے ہیں کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ ویسے میں چاہتی ہوں کہ ایم بی بی ایس کے بعد میں ایم ڈی کی ڈگری لے لوں، پھر اپنی مستقل بحالی کے بارے میں سوچوں گی۔''

''ارے بیٹی، لڑکی کے شباب کے دن زیادہ نہیں ہوتے۔ پھر کیا بڑھاپے میں نکاح کرو گی۔ اُس ٹائم تو تم سے شادی کرنے کے لیے کوئی لڑکا آگے آئے گا ہی نہیں۔ تمھاری بوا نے تو بہت پہلے تمھاری شادی اپنے بیٹے خالد سے کرنے کی تجویز پیش کی تھی مگر تمھارے ابو نے انکار کر دیا۔ وہ تمھیں پڑھا لکھا کر اپنی ٹانگوں پر کھڑا کرنا چاہتے ہیں۔''

''شادی اور اس جاہل گنوار سے جس نے بارہویں سے آگے تعلیم حاصل نہیں کی۔ فقط اپنے ٹھیکیدار باپ کی دولت پر اِتراتا ہے۔''

''اللہ کا شکر ہے کہ جو ہوا اچھا ہی ہوا۔ عبدالقادر نے خود ہی اپنے بیٹے کا مستقبل خراب

کر دیا۔ اس کی تعلیم ادھوری چھڑوا دی ۔ کہتا تھا کہ اسے تعلیم کی کیا ضرورت ہے، میرا کاروبار سنبھالے گا۔ یہاں تک کہ مجھے بھی تمھاری بوا نے یہی رائے دی تھی کہ بیٹی کو آگے مت پڑھاؤ، بگڑ جائے گی۔ ان دنوں تو عبدالقادر کی پوبارہ ہو رہی تھی۔''

''خالد بھائی نے تو ایک روز مجھ سے سرراہ بدتمیزی کر لی تھی۔ جب میں ویمنز کالج سے واپس گھر چلی آ رہی تھی تو راستے میں مجھے روک لیا اور مجھے پروپوز کرنے لگا مگر میں نے صاف انکار کر دیا۔ اب تو چلو جو ہوا، سو ہوا۔ اسکے بارے میں بات کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ خالد بھائی نے اپنی زندگی برباد کرنی تھی، سو کر لی۔ ممی، اب آپ جا کر سو جاؤ، رات بہت ہو گئی ہے، پھر آج تھکاوٹ بھی زیادہ ہو گئی ہے۔ مجھے جب شادی کرنے کا ارادہ ہو گا تو میں خود ہی آپ کو آگاہ کروں گی۔''

''ٹھیک ہے بیٹی، جیسے تمھاری مرضی۔ شب بخیر۔''

''شب بخیر، ممی۔''

(۱۴)

جے کشوری نے بیٹے کے مستقل ہوتے ہی اس پر شادی کرنے کے لیے دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ شریکِ حیات کی وفات کے بعد اسے ہر سو ویرانیاں ہی ویرانیاں نظر آ رہی تھیں۔ وہ اپنے گھر میں دوبارہ چھوٹے بچوں کی کلکاریاں سننے کی تمنّائی تھی۔ ایک بار ڈنر کرتے ہوئے وہ اپنے بیٹے سے مخاطب ہوئی۔ ''گوتم، اب تو تم نے پڑھائی بھی کر لی، نوکری بھی مستقل ہو گئی۔ میری ایک تجویز ہے، اب تم شادی کر لو۔ یہ میری دیرینہ آرزو ہے۔ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ مجھے نہ جانے کب یم راج کا بلاوا آئے، اس سے پہلے میں چاہتی ہوں کہ بہو کا چہرہ دیکھ لوں اور پوتے کو اپنی گود میں کھلاؤں۔''

''ماں، ابھی تو شادی کرنے میں کافی دیر ہے۔ ابھی مجھے اور بھی بہت سارے کام

ہیں۔سب سے زیادہ تو مجھے اس بات کی فکر ہے کہ کہیں پانچ دس مرلے کی زمین مل جائے تو ایک چھوٹا سا مکان بنوالوں۔ یہاں اس آبائی مکان کے تین شریک ہیں، دو چھوٹے چھوٹے کمرے اور کچن ہر ایک کے حصے میں آ گئے ہیں۔اس میں اب گزارا نہیں ہوتا۔پھر یہ علاقہ بھی تو بہت بھیڑ بھاڑ والا ہے، بہتر یہ رہے گا کہ ہم کہیں کسی نئی کالونی میں بسنے کی کوشش کریں۔اپنے حصے کے بارے میں میں نے بات کر لی ہے، دو لاکھ روپے ملتے ہیں۔اُدھر سرکار نے نئی کالونی میں زمین پلاٹ دینے کی ایک سکیم نکالی ہے جس میں پانچ مرلے کی زمین ایک لاکھ میں مل جائے گی۔اس پر مکان بنانے کے لیے مزید تین چار لاکھ کی ضرورت پڑے گی۔میں نے درخواست تو دے رکھی ہے، دیکھتا ہوں اگر پلاٹ الاٹ ہوا تو وہاں پر چھوٹا سا مکان بنوالوں گا۔"

"بات تو تم صحیح کہتے ہو مگر مجھے پتہ نہیں کیوں ڈر سا لگتا ہے۔ہمیشہ اندیشوں میں گھری رہتی ہوں کہ نہ جانے کب کیا ہوگا۔قسمت کی ماری ہوں اس لیے ڈراؤنے سپنے دیکھتی رہتی ہوں، وہ چاہے دن ہو یا رات۔انسان جب بے بس ہو جاتا ہے تو ذہن میں صرف منفی خیالات پیدا ہوتے ہیں۔"

"ماں، میں تمھاری حالت سمجھ سکتا ہوں۔تم نے تو زندگی بھر دکھ جھیلے ہیں۔مگر کیا کروں میں خود ایسے دوراہے پر کھڑا ہوں جہاں منزل کا تعین کرنا مشکل ہو رہا ہے۔انسان خوشیاں پانے کے لیے کبھی عجلت میں اپنے مستقبل کو ناپائیدار بنا دیتا ہے۔"

"ٹھیک ہے بیٹے، جیسے تمھاری مرضی۔تمھارے پتا جی کی پنشن و گریچوٹی کے کچھ روپے میں نے بچا کے رکھ لیے ہیں، جب ضرورت ہو تو مانگ لینا۔اس وقت کام نہیں آئیں گے تو پھر کب آئیں گے۔"

بنگلہ دیش کی آزادی کے بعد برصغیر میں کئی تبدیلیاں دیکھنے کو ملی تھیں۔ ہندوستان نے پاکستان کے دو ٹکڑے کر کے اپنی طاقت و برتری کا مظاہرہ کیا تھا۔اُدھر شیخ محمد عبداللہ کو یہ سمجھ آیا تھا کہ برصغیر کا سیاسی نقشہ بدل گیا ہے اس لیے اس نے مرکزی حکومت سے مفاہمت کرنے کے لیے

اپنے سفیر بھیج دیے۔ کشمیریوں نے بھی اس بدلے ہوئے جغرافیائی منظر نامے کو تسلیم کیا۔ جہاں تک کشمیری پنڈتوں کا سوال تھا وہ آزادی کے بعد ڈرے ڈرے اور سہمے سہمے سے رہتے تھے کیونکہ انھیں خدشہ تھا کہ نہ جانے کب کشمیر ہندوستان سے الگ ہو جائے گا۔ مگر اب انھیں یقین ہو گیا کہ دنیا کی کوئی طاقت نہیں ہے جو کشمیر کو ہندوستان سے الگ کر سکتی ہے۔ اس لیے اب وہ بھی نئی نئی بستیوں میں مکانات بنوانے لگے اور کھلی فضاؤں میں رہنے کی کوشش کرنے لگے۔ سرینگر، اننت ناگ اور بارہ مولہ کے قرب و جوار میں کئی نئی کالونیاں وجود میں آ گئیں جہاں کشمیری پنڈتوں نے اپنے گھر بنوائے اور ٹھاٹ سے رہنے لگے۔

گوتم سپرو کے نام بھی سرکار نے لاٹری کے ذریعے ایک چھوٹا سا پلاٹ الاٹ کر دیا۔ اس نے ماں سے روپے لے کر پلاٹ کی رقم جمع کر دی اور پھر پلاٹ کی ملکیت کے کاغذات بنوانے کے لیے تگ و دو کرتا رہا۔ اس دوران اس نے اپنے آبائی مکان کی فروخت کے لیے مکان کے دوسرے حصہ داروں سے بات کی۔ اسے اس بات کا احساس تھا کہ خریدنے کا پہلا حق انہی کا بنتا ہے اور اگر وہ چند ہزار روپے کم بھی دیں پھر بھی وہ ان کو فوقیت دے گا۔ دو میں سے ایک شریک نے دلچسپی دکھائی اور چند مہینے ٹھہرنے کی درخواست کی۔ چونکہ اتنا ہی ٹائم گوتم کو پلاٹ کی رجسٹریشن میں بھی لگنے والا تھا اس لیے سودا طے ہو گیا۔ ساتھ میں یہ بھی اقرار ہوا کہ گوتم اپنا حصہ رقم وصول ہونے کے چھ مہینے بعد خالی کرے گا جب تک اس کا مکان بن چکا ہوگا۔ وہ اپنی ماں کو ہر قدم پر باخبر رکھتا تھا۔ ایک مہینے بعد پلاٹ گوتم سپرو کے نام ٹرانسفر ہوا اور کورٹ میں اس کا بیعہ نامہ بھی رجسٹر ہوا۔ گوتم نے بغیر کسی توقف کے آبائی مکان کے خریدار سے روپے وصول کیے اور اپنا نیا مکان بنانا شروع کر دیا۔ اس کو کچھ سرمایہ محکمہ تعلیم سے، جہاں وہ ملازمت کرتا تھا، بطور ہاؤسنگ لون لینا پڑا جو اس کی تنخواہ سے ماہانہ قسطوں میں کٹتا رہا۔ گوتم نے ایک چھوٹے سے خوبصورت مکان کا نقشہ بنوایا جو ماں اور بیٹے کے لیے کافی تھا۔ اس میں دو کمرے، بیٹھک، کچن اور دو باتھ روم تھے۔ اس کے علاوہ ڈھلواں

قلعی کیا ہوا لوہے کی نالی دار چادروں، جنھیں ٹین کی چادریں کہا جاتا ہے، کی چھت کے نیچے دو چھوٹے چھوٹے کمرے اور اسٹور روم بنانے کی گنجائش تھی۔ نقشہ متعلقہ محکمہ سے پاس کرایا گیا، پھر راج مستری اور ترکھان دونوں سے بات ہوئی اور مکان کی تعمیر کا کام شروع ہوا۔

پانچ مہینوں میں مکان تعمیر ہوا۔ پہلے دیواریں کھڑی کر دی گئیں، پھر دروازے اور کھڑکیاں لگ گئیں اور اس کے بعد چھت کی سلیب ڈالی گئی۔ چھت کے اوپر ٹاٹا ٹین کی چادریں بچھائی گئیں۔ اندر کا پلستر، بجلی اور سینیٹری کا کام بھی ساتھ ساتھ میں مکمل ہوتا رہا۔ البتہ کچھ چھٹ پُٹ کام جیسے الماریاں بنانا، دیواروں کا پینٹ کرنا وغیرہ باقی رہ گیا جسے گھر میں داخل ہونے کے بعد مکمل کیا گیا۔ چھٹے مہینے میں جنتری سے شبھ مہورت نکال کر گرہ پرویش کیا گیا اور دوسری جانب آبائی مکان کا حصہ خریدار کے حوالے کر دیا گیا۔

گوتم سپرو خطوط کے ذریعے مہک کو گھر کی تعمیر کے مراحل سے باخبر رکھتا۔ وہ مکان کی جزئیات کے بارے میں ہر تفصیل سے مہک کو آگاہ کرتا اور کبھی کبھار اس سے مشورہ بھی لیتا۔ اندر کون سا رنگ کہاں کرنا ہے اس کا فیصلہ مہک ہی نے کیا۔ کچن کے بارے میں بھی اس نے کئی مفید مشورے دیے۔ وہ من ہی من میں بہت خوش ہو رہی تھی اور چاہتی تھی کہ مکان کو دیکھنے کے لیے اڑ کر کشمیر پہنچ جائے تا کہ وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے کہ اس کے محبوب نے کیسا مکان تعمیر کیا ہے۔ جس دن گرہ پرویش تھا اس دن تو وہ دن بھر اسی سوچ میں ڈوبی رہی کہ کاش میں اس وقت گوتم کے ساتھ ہوتی۔ اس نے گوتم کے ساتھ رہنے کے کئی خواب بُنے تھے حالانکہ اسے معلوم تھا کہ ان کی تعبیر میں کئی رکاوٹیں آسکتی تھیں۔ پھر بھی وہ اپنے ارادے میں ثابت قدم تھی۔

(۱۵)

اس سال مہک کے والدین دسمبر ہی میں دہلی چلے آئے اور اپنے گھر میں قیام کر لیا۔ ابو تو دو ہفتے کے بعد جموں واپس چلے گئے مگر امّی مارچ تک یہیں رک گئی۔ مہک کی پڑھائی کا آخری

سال تھا، اس کے بعد انٹرن شپ تھی۔ غرض تعلیم ختم ہونے والی تھی اور پھر تربیت کے لیے ہسپتال میں کام سیکھنا تھا۔

اس بار بھی شیریں نے مہک سے شادی کے بارے میں پوچھ لیا مگر وہ ٹال مٹول کرتی رہی۔ وہ ماں سے مخاطب ہوکر کہنے لگی۔ ''امی جان، ابھی تو میرا ایم بی بی ایس مکمل ہونے والا ہے۔ دوسرے سال انٹرن شپ ختم ہو جائے گی اور پھر مجھے ایم ڈی کی ڈگری لینے کا ارادہ ہے۔ تم تو جانتی ہو کہ ہمارے مرداساس سماج میں خواتین کو کم پایہ مانا جاتا ہے اوران کی ترقی کے راستے بند کردیے جاتے ہیں۔ انھیں اپنی مرضی سے جینے کا حق نہیں ملتا ہے۔ میں اس قید و بند سے چھٹکارا پانا چاہتی ہوں۔ مجھے اپنی زندگی میں کچھ حاصل کرنے کی آرزو ہے۔''

منیر ملِک ان کا مکالمہ خاموشی سے سن رہا تھا، اس لیے تردّد میں پڑ گیا۔ وہ خود بھی اسی مرداساس سماج کا رکن تھا جس کے بارے میں مہک بات کر رہی تھی۔ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا ردِ عمل ظاہر کرے۔ ہمت کرکے اس نے اپنی بیٹی سے کہا۔ ''نہیں مہک بیٹی، ایسا نہیں ہے، ہر کوئی ایسا نہیں ہوتا۔ تعلیم انسان کو وسیع النظر بناتی ہے۔ پڑھا لکھا انسان دوسرے انسانوں کی اتنی ہی قدر کرتا ہے جتنی وہ اپنی کرتا ہے وہ چاہے مرد ہو یا عورت۔ وہ کبھی کسی کا استحصال نہیں کرنا چاہتا ہے۔ تم اطمینان رکھو ہم ایسا ہی بَر ڈھونڈ لیں گے جو تمھاری عزت کرے گا اور تمھاری اڑانوں کے لیے حمایتی اور عمل انگیز ثابت ہوگا۔''

''ڈیڈی انسان برف کے تودے کی مانند ہوتا ہے، ایک حصہ ظاہر اور اُنیس حصہ پوشیدہ۔ اس کی سرشت کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ مرد عورت برسوں ساتھ رہ کر بھی ایک دوسرے کو سمجھنے میں ناکام رہتے ہیں پھر ایک یا دو ملاقاتوں میں انسانی خصلت کا کیسے پتہ چلے گا؟''

''نہیں بیٹی، ایسا نہیں ہے۔ خاندان اچھا ہو، تعلیم ڈھنگ کی ہو اور وتیرہ اچھا ہو تو انسان کے اچھا ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہوتا۔ وہ کہتے ہیں نا کہ ؎ آدمی پہچانا جاتا ہے قیافہ دیکھ کر، خط کا مضمون بھانپ لیتے ہیں لفافہ دیکھ کر۔''

''ڈیڈی، ایسا ہوتا تو کیا بات تھی ۔مگر آئے دن کی گھریلو تشدد کی دل دہلانے والی خبریں، ازدواجی رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ، بات بے بات پر طلاق اور خودکشی، خواتین میں بڑھتے ہوئے دماغی امراض کے واقعات، یہ سب کیا ظاہر کرتے ہیں؟ دراصل شوہر ملنا تو آسان ہے مگر ہم سفر ملنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ میں اپنی زندگی کے نصب العین کو ازدواجی بھٹی میں راکھ ہوتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتی۔''

''مہک بیٹی، مجھے شک ہورہا ہے کہیں تمھاری بوا صحیح تو نہیں کہتی تھی کہ لڑکی تعلیم پاکر راہ سے بے راہ ہوتی ہے۔تم تو بہکی بہکی باتیں کرنے لگی ہو۔گھر بسانا تو لڑکی کا پہلا فرض ہوتا ہے اور وہ لڑکی جو گھر بسانے سے گریز کرتی ہے اس کی سماج میں کوئی عزت نہیں ہوتی۔'' باپ بیٹی کی بات بیچ میں کاٹ کر شیریں ملک بول اٹھی۔

''امی، میں نے گھر بسانے سے کبھی انکار نہیں کیا۔مگر ہر کام کا اپنا ایک وقت ہوتا ہے۔ جب گھر بسانے کی باری آئے گا تو میں خود ہی بتاؤں گی۔ابھی تو میری تعلیم حاصل کرنے کا وقت ہے اس سے مکمل تو ہونے دو۔''

''بیٹی، تب تک تو تیری جوانی چلی جائے گی۔ پھر اچھا اور موزوں لڑکا ملنا مشکل ہوگا۔ کوئی بھی لڑکا کسی ایسی لڑکی سے ازدواجی رشتہ قائم نہیں کرنا چاہتا ہے جس کی جوانی ڈھل چکی ہو۔''

''امّی جاں، ہوسکتا ہے آپ اپنے مشاہدے کے باعث اس نتیجے پر پہنچی ہوں۔مگر آپ ہی مجھے بتائیے کہ اگر میں نے ڈاکٹری نہ کی ہوتی، ابو کی بہن کی بات مان لی ہوتی اور اس کے بیٹے خالد بٹ سے شادی کی ہوتی تو میرا کیا حشر ہوا ہوتا؟ خالد بھائی کا سنا ہے کہ شراب بھی پیتا ہے اور نشہ بھی کرتا ہے۔تعلیم یافتہ ہوتا تو شاید یہ حالت نہ ہوتی۔امّی سوچ لو اگر میں اس گھر میں بیاہی گئی ہوتی تو میرا اس وقت کیا حال ہوتا۔''

شیریں ملِک کو اس جواب کی امید نہ تھی۔ وہ تو بیٹی کے مستقبل کے لیے فکر مند تھی اور اپنی سوچ کے اعتبار سے اپنی رائے دے رہی تھی۔ بیٹی کا جواب سن کر وہ بالکل خاموش ہوگئی اور

آگے کچھ بھی نہ بول پائی۔ اس کے منہ سے صرف اتنا نکلا۔ ''ٹھیک ہے بیٹی، جیسا تم مناسب سمجھو، اب تو تم سیانی ہو چکی ہو، دنیا کی اونچ نیچ سے واقف ہو، پھر میرا اور تمھارا کیا مقابلہ، میں تو ٹھہری ان پڑھ گنوار عورت۔'' اس کے لہجے سے طنز صاف جھلک رہا تھا۔

منیر ملک کو معاملے کی نزاکت کا احساس ہوا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ بات اور آگے بڑھ جائے، اس لیے بیٹی سے بالراست مخاطب ہوا۔ ''مہک، دراصل تمھاری ماں جو کہتی ہے وہ اس سماج کی صدائے بازگشت ہے جس میں ہم سانس لے رہے ہیں۔ ہمارے مشرقی سماج میں جون آف آرک، فلورنس نائٹ انگیل، میری کیوری اور مدر ٹریسا جیسی خواتین کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ ہم نے جنگجو خواتین تو پیدا کر لیں اور ان کو سراہا بھی مگر سائنس دان، مفکر اور انسانی دکھ درد بانٹنے والی خواتین کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ تم اپنی ماں کی بات پر دوبارہ غور کر لو، ابھی تو بہت وقت پڑا ہے، اس میں جلد بازی سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ ٹھنڈے دماغ سے سوچنے میں ہی کام بگڑنے سے بچ جاتا ہے۔ ہم آج ہیں، کل نہ رہیں تو اس وقت تم اکیلی رہ جاؤ گی۔ آگے پیچھے، دائیں بائیں کوئی سہارے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھائے گا۔ عقلمند انسان وہ ہوتا ہے جو زندگی کی حقیقتوں سے آنکھ نہیں چراتا بلکہ ان کا سامنا کرتا ہے۔''

اس بار منیر ملک اپنی فیملی کو لے کر تاج محل، آگرہ فورٹ، فتح پور سیکری اور اسکندرا چلا گیا۔ تاج محل کے بارے میں تو اس نے سنا تھا مگر دیکھ کر حیران ہو گیا۔ سفید سنگ مرمر کا بنا ہوا یہ مقبرہ شاہ جہاں نے بنوایا تھا۔ زندگی کے آخری لمحات میں جب اسے اپنے ہی بیٹے اورنگ زیب نے آگرہ قلعے میں نظر بند کیا تھا تو شاہ جہاں تاج محل کو رات دن دیکھ کر زندگی کا ایک ایک لمحہ گزارتا رہا۔ انسانی زیست کا سبق آموز انجام اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے۔ ایک شہنشاہ جس نے سنگ مرمر کا یہ مقبرہ اپنی چہیتی ملکہ کے لیے بنوایا تھا عمر کے آخری پڑاؤ پر زندگی کی ہر سانس کے لیے ترستا رہا اور اپنی محبوبہ کے مقبرے کو دیکھتا ہوا جنت نشین ہوا۔ آگرہ فورٹ تو لودھی سلطنت سے لے کر مغل بادشاہوں تک تختِ شاہی رہا مگر شاہجہاں کے دور میں دارالخلافہ دہلی تبدیل ہوا۔ فتح پور سیکری نام

سے شہنشاہ اکبر نے خواجہ سلیم چشتیؒ کی پیدائشی جگہ پر ایک چھوٹا سا شہر بسایا تھا۔ خواجہ کی برکت ہی سے اکبر کے یہاں بیٹا سلیم پیدا ہوا تھا۔ اکبر کا مقبرہ اسکندرا میں ہے۔ مہک ملِک کی خواہش تھی کہ کرشن کی جنم بھومی متھرا اور برندابن راستے میں دیکھ لے مگر اندھیرا ہونے کے سبب اس کی بات من ہی میں رہ گئی جب تک وہ واپس دہلی پہنچ گئے۔

تعلیم مکمل کر کے انٹرن شپ کے دوران مہک ملِک سینئر ڈاکٹروں کی رہنمائی میں مریضوں کا معائنہ کرتی، ان کا نبض دیکھتی، تھرمامیٹر سے بدن کی حرارت دیکھتی، ہارٹ بیٹ چیک کرتی اور پھر ان کو سینئر ڈاکٹر کے نسخے پر عمل کرنے اور کھانے و پرہیز کے بارے میں ہدایت کرتی۔ زچگی کے آپریشن کے دوران بھی وہ تھیئٹر میں ان کی مدد کرتی اور آپریشن کے عمل کو غور سے دیکھتی۔ تربیت کے یہ لمحے اس کے لیے بہت ہی مفید تھے۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اسے اب وظیفہ بھی ملنے لگا تھا۔ پہلے وظیفے سے اس نے اپنے والدین کے لیے تحفے خرید لیے جو اس نے پارسل کر کے اپنے والد کو بھیج دیے۔

اپنی اولاد کی پہلی تنخواہ سے لایا ہوا تحفہ والدین کے لیے کسی تبرک سے کم نہیں ہوتا ہے۔ دونوں، میاں بیوی، تحفے پا کر بہت خوش ہوئے اور اپنی بیٹی کو ڈھیر ساری دعائیں دیں۔

(۱۶)

مہک ملِک نے جونہی ایم بی بی ایس کا انٹرن شپ پورا کیا تو اس کو دہلی کے کئی ہسپتالوں سے آفر ملی کیونکہ اس نے امتیازی نمبرات سے ڈگری حاصل کر لی تھی۔ وہ چاہتی تو سرینگر آ کر کہیں ملازمت کر لیتی مگر اس نے آل انڈیا میڈیکل انسٹی ٹیوٹ میں نوکری کرنا پسند کر لیا کیونکہ وہاں عمیق تجربہ حاصل کرنے کے کئی مواقع مل سکتے تھے۔ بہر حال اس کی نظر ایم ڈی پر تھی جو وہ کسی بھی صورت میں یہاں سے کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے دو سال کی ملازمت کے بعد اس نے انٹرنس کا امتحان پاس

کیا اور ایمز میں ایم ڈی (گائنیکولوجی اور آبسٹر یٹکس) کے دوسالہ کورس میں داخلہ لیا۔ یہ اس کی دیرینہ تمنّا تھی جو پوری ہوگئی۔ حالانکہ اگلے دو سال بِتانا اس کے لیے بہت کٹھن تھے۔ ایک تو پیشے کا دباؤ، دوسرا والدین سے دور رہنا اور پھر گوتم سے دوری۔ بہر کیف اوکھلی میں سر دیا تو پھر موسلوں سے کیا ڈر۔ وہ اپنی آرزو کی تکمیل میں رات دن جُٹی رہی۔ اطمینان کی جو بات تھی وہ یہ کہ ایم ڈی کورس کے دوران اسے سرکار کی طرف سے وظیفہ ملتا رہا۔ کبھی ماں باپ کی یاد آتی اور کبھی گوتم کی۔ سب کے ساتھ خط و کتابت جاری تھی۔ والدین کے ساتھ ٹیلی فون پر بھی بات ہوتی تھی۔ اب تو گوتم کے یہاں بھی ٹیلیفون لگ گیا تھا اور اسے براہ راست بات ہو جاتی تھی۔ کبھی گوتم کی ماں ریسیور اٹھالیتی تھی تو وہ فوراً ٹیلی فون کاٹ لیتی تھی۔ مگر جے کشوری کو کچھ شک پڑ گیا تھا کیونکہ جب گوتم ٹیلی فون اٹھاتا تو بہت دیر تک باتیں ہوتی تھیں۔ البتہ لڑکی کون ہے اور کہاں سے بات کرتی ہے، اس کے بارے میں اسے کچھ معلوم نہ تھا۔ کئی بار اپنے بیٹے سے اس بارے میں استفسار کیا مگر وہ اِدھر اُدھر کی کہانیاں سنا کر بات ٹالتا رہا۔ گوتم کو بھی سرکار نے بی ایڈ کے لیے نامزد کر دیا اور وہ بھی ایک سالہ بی ایڈ کورس کے لیے گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن سرینگر میں بی ایڈ کرنے لگا۔

جب آدمی مصروف ہو جاتا ہے تو اسے وقت گزرنے کا خیال ہی نہیں رہتا۔ اِدھر گوتم نے بی ایڈ مکمل کیا اور اُدھر مہک نے ایم ڈی کا پہلا سال مکمل کیا۔ دوسرے سال بھی وہ بڑے انہماک سے اپنی تعلیم جاری رکھے ہوئے تھی۔ اپنے خطوط میں گوتم ہر بار یہی تاکید کرتا تھا کہ واپس چلے آؤ، اب تعلیم بہت ہوئی، والدین کی اکلوتی بیٹی ہو، انھیں تمھاری غیر حاضری کھلتی ہوگی۔ وہ تم کو کہہ نہیں پاتے ہیں مگر بڑھاپے میں ماں باپ کی یہی تمنا رہتی ہے کہ ان کی اولاد ان کی آنکھوں کے سامنے رہے۔ اس کے بار بار لکھنے سے مہک کے دل پر کافی اثر ہوا اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ایم ڈی کی ٹریننگ ختم کرتے ہی واپس سرینگر جائے گی اور وہیں پر کسی اسپتال میں نوکری کرے گی۔

(۱۷)

آزادی کے بعد کشمیر کی سیاست نے کئی کروٹیں لیں۔ ۱۹۵۳ء میں بخشی غلام محمد نے شیخ محمد عبداللہ کو جیل میں ڈال کر وزیر اعظم کا عہدہ سنبھالا کیونکہ شیخ محمد عبداللہ نے دہلی سے لوٹ کر رنبیر سنگھ پورہ میں ہندوستان کے خلاف زہر اگلا تھا۔ ان دنوں ریاست میں وزیر اعلیٰ کے بدلے وزیر اعظم ہوتا تھا۔ اِدھر جموں میں پرجا پریشد پارٹی نے زمینی اصلاحات کے احتجاج میں مورچہ کھولا تھا اور اُدھر دہلی میں سوائے نہرو کے عبداللہ کو کسی کی حمایت حاصل نہیں تھی۔ شیخ محمد عبداللہ نے رائے شماری کی راگ الاپنی شروع کر دی اور محاذ رائے شماری کی بنیاد ڈالی۔ بخشی غلام محمد کوئی عوامی رہنما تو تھا نہیں اس لیے اس نے 'کھاؤ اور کھانے دو' کے قول پر عمل کر کے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ رشوت خوری اور کنبہ پروری کا چلن عام ہو گیا اور لوگوں کو سبسڈیوں سے خوش کر کے اس نے کئی سال حکومت کی جس کا کچا چٹھا بعد میں آئینگر کمیشن کے توسط سے لوگوں کے سامنے آ گیا۔ آخر کار ۱۹۶۳ء میں کامراج پلان کے تحت بخشی غلام محمد کو وزیر اعظم کی کرسی سے استعفیٰ دینا پڑا۔ اسکے باوجود اس نے اپنا اثر ورسوخ برقرار رکھنے کے لیے اپنے ہی ایک وفادار، خواجہ شمس الدین کو وزیر اعظم کی کرسی پر بٹھا دیا لیکن وہ نالائق نکلا اور زیادہ دیر تک نہیں ٹک سکا۔ ۲۷/دسمبر ۱۹۶۳ء کو حضرت بل درگاہ سے پیغمبر اسلام ؐ کا موئے مبارک چوری ہوا اور اس کے ساتھ ہی کشمیر میں بہت بڑے پیمانے پر احتجاج ہوا۔ مظاہرے تب تک جاری رہے جب تک ۴/جنوری ۱۹۶۴ء کو موئے مبارک کے مل جانے کا اعلان نہ ہوا۔ لال بہادر شاستری نے بڑے احترام سے اسے اپنی متبرک جگہ پر واپس رکھوا دیا۔ اس کے ترت بعد خواجہ شمس الدین کے بدلے خواجہ غلام محمد صادق کو جموں و کشمیر کا وزیر اعلیٰ بنایا گیا۔ ۱۹۶۷ء میں دوبارہ اسمبلی الیکشن ہوا اور صادق نے پھر سے کرسی سنبھالی۔ خواجہ غلام محمد صادق کا دور حکومت قدرے پرسکون رہا اور ریاست جموں و کشمیر قانونی طور

پر مرکز کے بہت قریب آ گیا۔ شیخ محمد عبداللہ کو قید سے رہا کیا گیا مگر اس کا دم خم پہلے جیسا نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ البتہ صادق کے جانشین میر قاسم میں ویسی سوجھ بوجھ نظر نہیں آ رہی تھی جیسی اس کے پیش رو میں تھی۔

کشمیر کے سیاست دان رعایا کو ہمیشہ دھوکا دیتے رہے۔ اس کارروائی میں مرکزی سرکار ان کی پشت پناہی کرتی رہی۔ آزادی کے بعد جتنے بھی انتخابات ہوئے ان میں ہر بار دھاندلیاں ہوتی رہیں۔ کبھی جعلی ووٹروں سے زبردستی ووٹ ڈلوائے گئے، کبھی بیلٹ بکس بدلے گئے اور کبھی گننے میں ہیرا پھیری کی گئی۔ یہاں تک کہ حزبِ اختلاف کے کارکنوں کو کسی نہ کسی بہانے زدوکوب کیا گیا۔ برسر اقتدار پارٹی، جسے مرکزی حکومت کی سرپرستی حاصل ہوتی، پولیس کی مدد سے جو چاہتی وہ کروالیتی۔ البتہ اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ صرف مرارجی ڈیسائی کے زمانے میں غیر جانب دارانہ انتخابات کرائے گئے یہاں تک کہ مرارجی نے مولوی فاروق کو، جو پاکستان کا حمایتی تھا، اپنے شیشے میں اُتارا اور اس کے توسل سے ریاست میں جنتا پارٹی کی بنیاد ڈالی اور اس کو پارٹی کا صدر منتخب کیا۔ انتخابات میں جنتا پارٹی کے انتخابی نشان پر مولوی فاروق نے اپنے امیدوار میدان میں اتارے حالانکہ اسے زیادہ کامیابی نہیں ملی۔ ان انتخابات کا گن گان آج بھی سبھی لوگ کرتے ہیں۔

ملواں تہذیب وثقافت کی امتیازی خصوصیت کے باعث جموں وکشمیر میں عام طور پر فرقہ وارانہ رواداری رہی ہے یہاں تک کہ مہاتما گاندھی کو کشمیر کی مذہبی ہم آہنگی دیکھ کر یہاں ایک امید کی کرن نظر آئی تھی۔ مگر یہ سلسلہ گرگ باراں دیدہ سیاست دانوں کے سائے میں کہاں تک چلتا...! برصغیر کے سیاست دانوں نے انگریزوں سے کم سے کم اتنا تو سیکھ لیا تھا کہ 'پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو' بہترین پالیسی ہے۔

کانگریس کے مقامی نیتاؤں نے اقتدار کی خاطر ۱۹۸۶ء میں اننت ناگ میں کشمیری پنڈتوں کے خلاف دنگے کروائے اور کئی گھروں کو نذر آتش کروایا۔ بہرحال کشمیری پنڈت کسی بھی

صورت میں جنگجو قوم نہیں بن سکتی اس لیے متاثرہ لوگوں نے اسے اپنی بدنصیبی سمجھ کر خاموشی سے برداشت کرلیا۔ ایسی امن پسند قوم تو دنیا میں خال خال ہی مل سکتی ہے۔ آزادی کے بعد ایک منصوبہ بند سازش کے تحت ریاستی مسلمانوں کو ان کے خلاف یہ کہہ کر بھڑکایا جاتا رہا کہ اس فرقے نے سرکاری ملازمتوں پر اجارہ داری قائم کی ہے جس کی وجہ سے سرکاری نوکریوں میں مسلمانوں کی شرح فیصدی بہت کم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کشمیری پنڈت چونکہ برہمن ہیں، اس لیے علم حاصل کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ جموں و کشمیر میں پرائیویٹ انٹر پرائز کا فقدان ہونے کے سبب پنڈتوں کے لیے سرکاری ملازمت ہی ایک واحد روزگار کا وسیلہ رہا ہے، اس لیے وہ اپنی پوری توجہ پڑھائی کی طرف دیتے ہیں۔ اپنی محنت و مشقت سے وہ امتیازی نمبرات لے کر کامیاب ہوتے ہیں اور اپنی قابلیت کے بل بوتے پر سرکاری نوکریوں، چاہے وہ ریاستی ہوں یا مرکزی، کے دعویدار بن جاتے ہیں۔ اس کے باوجود آزادی کے بعد ریاستی نوکریاں حاصل کرنے میں انھیں کئی طرح کی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ انھیں اہلیت اور قابلیت کے حساب سے وہ سب کچھ نہیں مل پایا جو ان کا حق تھا۔ چنانچہ سرکاری ملازمت پانے کی خاطر زبانی انٹرویو کا بہت بڑا عمل دخل ہوتا ہے اور اس میں سفارش، کنبہ پروری اور رشوت کی بہت گنجائش ہوتی ہے، اس لیے ان کے انتخاب کی شرح روز بروز گھٹتی رہی۔ پھر بھی سرکاری ملازمتوں میں آبادی کے اعتبار سے کشمیری پنڈتوں کی تقابلی شرح زیادہ نظر آتی تھی۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں، ڈوگروں اور سکھوں کے پاس روزگار کے کئی آپشن ہیں جہاں کافی آمدنی کے امکانات ہوتے ہیں، اس لیے انھیں سرکاری نوکریوں میں اتنی زیادہ دلچسپی نہیں رہتی۔ ان فرقوں میں تعلیم حاصل کرنے کا ایسا جنونی رجحان نہیں ملتا جیسا کشمیری پنڈتوں میں۔ بہر صورت سکّے کا دوسرا رخ بھی ہے۔ باقی میدانوں میں کشمیری پنڈتوں کو نظر انداز کیا جاتا رہا۔ گو دیہی علاقوں میں کشمیری پنڈتوں کے پاس کھیت کھلیان بھی تھے اور میوہ باغات بھی، پھر بھی زراعت، میوہ فروشی اور تجارت کے میدانوں میں دوسرے فرقوں کا یوگدان بہت زیادہ رہا۔ غور سے دیکھا جائے تو آزادی کے بعد ترقیاتی کاموں، صنعت

کاری اور سیاحت کے نام پر جتنا بھی سرکاری سرمایہ ریاست میں تقسیم ہوا، اس سب پر مسلمانوں اور ڈوگروں کا اختیار رہا جبکہ کشمیری پنڈتوں کی جھولی میں اس کا برائے نام حصہ آیا۔ صنعت کاری میں رشوت خوری اور لائسنس راج مانع رہے۔ یہی وجوہات ہیں کہ اس فرقے کو سرکاری نوکریوں کے بغیر کسی اور کام میں کوئی دلچسپی نہیں رہی۔

ساتویں دہائی کے اوائل میں مشرقی پاکستان میں آزادی کی تحریک چلی جس کی وجہ سے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ سقوطِ بنگلہ دیش کے بعد شیخ محمد عبداللہ کو ہندوستان کی طاقت اور دبدبے کا اندازہ ہوا، اس لیے اس نے دوبارہ پینترا بدل کر مفاہمت کا راستہ اپنالیا۔ اِندرا گاندھی نے اسے واپس جموں و کشمیر کا وزیرِ اعلیٰ بنالیا۔ ۱۹۷۵ء کے اِندرا شیخ معاہدے، جس پر مرزا افضل بیگ اور جی پارتھا سارتھی نے دستخط کیے تھے، کے تحت شیخ محمد عبداللہ نے وزیرِ اعلیٰ کا عہدہ سنبھال لیا۔ واضح رہے کہ اب وہ وزیرِ اعلیٰ تھا، وزیرِ اعظم نہیں۔ ابتدا میں اس نے انتظامیہ کی تطہیر کا اعلان کر دیا اور ریاست سے رشوت ستانی اور کنبہ پروری ختم کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ رفتہ رفتہ وہ اور اس کی پارٹی اُسی رنگ میں رنگ گئی جس میں اس کے پیش رو رنگے تھے۔ شیخ محمد عبداللہ سے لوگوں کو بہت ساری امیدیں تھیں مگر وہ دھیرے دھیرے ٹوٹ گئیں اور مایوسی میں بدل گئیں۔ اس پر طرّہ یہ کہ اس نے اپنے دیرینہ رفیق کاروں جیسے مرزا افضل بیگ اور جی ایم شاہ کو، جنھوں نے ماضی میں مشکل ترین حالات میں اس کا ساتھ نبھایا تھا، نظر انداز کر کے اپنے بیٹے فاروق عبداللہ کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ شیخ محمد عبداللہ کی رحلت کے بعد فاروق عبداللہ نے کانگریس کی مدد سے ریاست کے وزیرِ اعلیٰ کا عہدہ سنبھالا لیکن نیشنل کانفرنس اور کانگریس کی باہمی رسہ کشی اور نیشنل کانفرنس کی اندرونی شکر رنجی سے حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے جس کا خمیازہ ریاست کو اٹھانا پڑا۔

اُدھر گذشتہ صدی کے آٹھویں دہے میں سوویت روس اور افغانستان کے درمیان جنگ میں طالبان اور پاکستان نے امریکا کی مدد سے روس کی فوجوں کو پسپا کر دیا یہاں تک کہ انھیں

افغانستان سے کھدیڑ دیا۔اس شکست کے موجب سوویت روس کے کئی سرحدی حصے اس سے علیٰحدہ ہو گئے اور ان کے پاس صرف روس کا علاقہ رہ گیا۔ چونکہ روس ہندوستان کا حلیف تھا اس لیے پاکستان اس موقعے کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا تھا۔اس نے کشمیر میں اپنی سرگرمیاں تیز تر کر لیں۔ دراصل جب سے پاکستان نے ۱۹۷۱ء کی جنگ ہاری تھی اور بنگلہ دیش کی آزادی کے ساتھ ہی پاکستان کے دو ٹکڑے ہو چکے تھے، پاکستان کے اعلیٰ فوجی حکام بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر ہندوستان سے بدلہ لینے کی فراق میں آتش زیر پا تھے۔البتہ ان کو اس بات کا احساس تھا کہ ماضی میں ۱۹۴۷ء، ۱۹۶۵ء اور ۱۹۶۷ء میں ان کی کوششیں ناکام رہی تھیں۔اس لیے انھوں نے اپنے قدم پھونک پھونک کر اٹھائے۔ابتدا میں انھوں نے ہندوستانی پنجاب میں خالصتانیوں کی حمایت کی اور انھیں نہ صرف پناہ دی بلکہ ان کو اسلحہ اور دیگر ساز وسامان بھی مہیا کرتے رہے جب تک کہ آپریشن بلیوسٹار میں ہندوستانی سیکورٹی فورسز نے ان کے رہنماؤں کا خاتمہ نہ کر دیا۔اسی دورانیے میں ان کی نظر کشمیر پر بھی مرکوز رہی جہاں وہ سمجھتے تھے کہ ان کے ہم مذہب رہتے ہیں اور ان کو دین کے نام پر بھڑکانا بہت آسان ہوگا۔اس لیے انھوں نے جماعت اسلامی کے توسل سے کشمیریوں کو مذہبی بنیاد پرستی اور جہاد سے روشناس کرانے کا سلسلہ شروع کیا جو کئی سال تک جاری رہا۔اس کارروائی کے ابتدائی اشارے اس وقت ملتے رہے جب پاکستان میں بھٹو کو پھانسی دی گئی یا پھر جنرل ضیا الحق ہوائی حادثے میں مارا گیا۔ دونوں مواقع پر کشمیر میں نیشنل کانفرنس اور جماعت اسلامی کے حامیوں کے درمیان کہیں کہیں جھڑپیں ہوئیں۔اسی تگ وتاز میں قریباً ۲۵۰۰ گاؤں کے مقامی نام بدل کر اسلامی نام رکھ دیے گئے۔علاوہ ازیں تبلیغ کے ذریعے کشمیر میں کٹر پرستوں کی ایک نئی نسل تیار کی گئی جن کو ہتھیار اٹھانے میں کوئی عار نہ تھا۔

کشمیر کی تاریخ کا یہ سب سے نازک دور تھا۔استحکام نام کی کوئی چیز نظر نہیں آتی تھی۔ سیاست دان اپنی اپنی ڈفلی اپنا اپنا راگ بجانے میں مگن تھے۔ ہر کوئی سیاسی بساط پر اپنی اپنی چال چل رہا تھا۔اس دوران جموں وکشمیر کی سیاست میں عدم استحکام رہا۔ ایک سرکار گرا دی جاتی تھی

اور دوسری سرکار بنادی جاتی تھی۔ ان ہی دنوں پاکستان کی شہ پر ریاست میں جماعت اسلامی نے اپنی جڑیں مضبوط کرلیں اور ایک بہت بڑا نیٹ ورک پھیلا دیا۔

۱۹۸۷ء کا ریاستی قانون ساز اسمبلی الیکشن جموں وکشمیر کی سیاسی تاریخ کا سب سے تاریک واقعہ ثابت ہوا جس نے نہ صرف یہاں کی سیاست بدل ڈالی بلکہ ایک نئے عسکری دور کی داغ بیل ڈالی۔ اس میں فاروق عبداللہ کو مسلم یونائیٹڈ فرنٹ (MUF) کا سامنا کرنا پڑا جس کی پشت پناہی جماعت اسلامی کررہی تھی اور جس نے عوام میں اس وقت تک کافی مقبولیت حاصل کرلی تھی۔ اس الیکشن میں نیشنل کانفرنس، کانگریس اور بی جے پی کے علاوہ دواور جماعتوں، مسلم یونائیٹڈ فرنٹ اور پیپلز کانفرنس نے شرکت کی۔ چونکہ مسلم یونائیٹڈ فرنٹ کا تعلق جماعت اسلامی سے تھا انھوں نے مسلسل تبلیغ کے ذریعے جنوبی کشمیر مثلاً اننت ناگ، پلوامہ، کولگام وغیرہ میں اپنی مقبولیت بڑھائی۔ اس پارٹی کو نہ صرف سرحد پار سے مدد مل رہی تھی بلکہ کئی بیرونی ممالک سے سرمایہ بھی فراہم ہورہا تھا۔ دوسری جانب شمالی کشمیر کے اضلاع مثلاً ہندوارہ، کپوارا، سنگرامہ، بانڈی پور وغیرہ میں پیپلز پارٹی نے اپنا دبدبہ قائم کیا۔ شکست کے اندیشے کے پیش نظر فاروق عبداللہ نے وہی پرانا ہتھ کنڈا اپنایا جو اس کے والد اور دوسری حکومتوں نے ماضی میں اپنایا تھا یعنی الیکشن میں دھاندلیاں کرکے نیشنل کانفرنس نے اپنی جیت درج کی اور مسلم یونائیٹڈ فرنٹ کو رعایتاً چار سیٹوں پر کامیاب قرار دیا گیا۔ نتیجتاً وادی میں بے چینی کی ایک لہر سی دوڑ گئی، مسلم یونائیٹڈ فرنٹ کے کئی لیڈروں نے سرحد پار کرکے ہتھیار اٹھا لیے اور باضابطہ عسکری جدو جہد کی بنیاد ڈالی۔

جمہوری انتخابات میں ہوئی دھاندلیوں اور ایم یو ایف کی شکست نے انھیں ایک بہانہ مہیا کیا جس کو لے کر وہ یہ جتلانے لگے کہ جموں وکشمیر میں نہ تو جمہوری نظام ہے اور نہ ہی حق خود ارادیت پانے کا کوئی امکان ہے۔ اس لیے ایم یو ایف کے رہنماؤں نے کشمیریوں کو ایک ہی طریقہ کار پر مرتکز ہونے کی ہدایت دی اور وہ تھا اقتدار بزور ہتھیار۔ کچھ وقفے کے بعد وادی سے

سیکڑوں نوجوان عسکری تربیت پانے کے لیے سرحد پار جانے لگے جہاں پاکستانی فوج نے ان کے لیے خصوصی ٹریننگ کیمپ قائم کیے تھے۔ واپسی پر وہ ہندوستانی سیکورٹی فورسز پر بم دھماکے کرنے، ہتھ گولے پھینکنے اور گولی باری کرنے میں مصروف ہوگئے۔ ان کے ساتھ باضابطہ تربیت یافتہ بدیسی زرخرید دہشت گرد بھی افراتفری پھیلانے کی غرض سے وادی میں داخل ہوتے رہے۔

۱۹۸۸ء میں جہاں ایک جانب بجلی کی قیمتوں میں اضافہ کرنے پر ریاست میں ہڑتالیں شروع ہوگئیں وہیں دوسری جانب جموں و کشمیر لبریشن فرنٹ نے پہلا بم سرینگر میں پھینکا اور اس کے بعد یہ سلسلہ مختلف طریقوں سے جاری و ساری رہا۔ اس طرح کشمیر میں دہشت گردی کا خونی کھیل شروع ہوا۔ ۱۹۸۹ء میں اس وقت کے کشمیری نژاد مرکزی ہوم منسٹر مفتی محمد سعید کی بیٹی روبیعہ سعید کو اغوا کیا گیا اور سرکار کو اس کے بدلے چار خوفناک دہشت گردوں کو رہا کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اس بات پر وزیراعلیٰ فاروق عبداللہ کو استعفیٰ دینا پڑا اور ریاست میں گورنر راج نافذ ہوا۔

جموں و کشمیر لبریشن فرنٹ اور دیگر تنظیموں نے روزانہ جلوس نکالے جو سرینگر کی سڑکوں سے گزرتے اور اپنی طاقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اقوام متحدہ کے دفتر تک پہنچ جاتے۔ واپسی پر کبھی کبھی بھیڑ مشتعل ہوکر سنگ باری اور آتش زنی پر بھی اتر آتی۔ جلوس میں مختلف لوگوں کے ہاتھوں میں مختلف قسم کے جھنڈے ہوتے۔ شاید تھامنے والے کو یہ بھی خبر نہ تھی کہ جو جھنڈا وہ اٹھائے ہوئے ہے وہ کس تنظیم کا ہے۔ گاؤ کدل کے سانحہ نے انتہا پسندوں کی اس مہم کو عوام سے جوڑ دیا اور کشمیری 'آزادی، آزادی' کے نعرے لگاتے ہوئے سڑکوں پر اتر آئے۔ سیکورٹی فورسز پر براہ راست حملے ہونے لگے، ان کو نشانہ بنا کر گولی باری کی جاتی، ہتھ گولے اور بم پھینکے جاتے، راکٹ داغے جاتے اور شاہراہوں پر مائنز بچھائی جاتیں۔ ردِعمل میں سیکورٹی فورسز جوابی کارروائی کرتے جس میں ملی ٹنٹوں کے علاوہ عام شہری بھی مارے جاتے۔

جستہ جستہ کشمیر میں عسکری جماعتیں کُکرمتوں کی طرح پھوٹتی رہیں اور سبھی ایک دوسرے سے سبقت لینے میں جُٹ گئیں۔ ان میں سے کچھ جماعتیں کشمیر کو آزاد کرنے کے لیے جدوجہد کر

رہی تھیں جبکہ کچھ جماعتیں کشمیر کو پاکستان کا حصہ بنانے کے خواب دیکھ رہی تھیں۔ اول الذکر آزادی پسند رہنماؤں نے جموں وکشمیر لبریشن فرنٹ اوراس سے متعلق جماعتوں کے جھنڈے تھام لیے جبکہ آخرالذکر پاکستان نواز رہنماؤں نے حزب المجاہدین اوراس سے متعلق جماعتوں کی بنیاد ڈالی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وادی میں بے شمار تنظیمیں وجود میں آگئیں مثلاً اللہ ٹائیگرس، حزب الاسلامیہ، لشکرطیبہ، حرکت المجاہد اسلامیہ، البدر، جیشِ محمد، حزب المجاہدین، البقر، وحدت الاسلام وغیرہ۔ چند ہی برسوں میں خفیہ طور پر دہشت گرد تنظیموں کا ایک جال بچھایا گیا جنھوں نے نہ صرف سرکاری دفتروں بلکہ مقامی حفاظتی اداروں میں کام کرنے والوں کو پوشیدہ طور پر بھرتی کرکے انھیں عسکری تربیت دی۔ چنانچہ اس ساری کارروائی کی کمان عسکریت پسندوں اور جماعت اسلامی کے ہاتھ میں تھی اوران کے آقا پاکستان سے انھیں رہنمائی کررہے تھے، اس لیے ہر مرحلے پر وہاں سے فرمان جاری ہونے لگے۔ پاکستان نے ابتدائی دور میں دونوں طرح کی تنظیموں کو نہ صرف امداد بہم پہنچائی بلکہ ان کے اراکین کو سرحد پار ملی ٹنسی کی ٹریننگ بھی دلوائی یہاں تک کہ چنندہ نوجوانوں کو طالبان سے بالراست تربیت حاصل کرنے کے لیے افغانستان بھیج دیا۔ ان تربیت یافتہ مجاہدین کو پاکستان نے سرمائے کے علاوہ اسلحہ، گولی بارود اور دیگر ضروری اشیا فراہم کیں۔ ان مجاہدین کا کام صرف اورصرف ہندوستانی فوج سے لڑنا تھا اور فوت ہونے کی صورت میں انھیں شہید کا درجہ دیا جانے لگا۔ بعد میں جب آزادی چاہنے والی تنظیموں اور پاکستان نواز تنظیموں میں باہمی مسابقت شروع ہوئی تو پاکستان نے اول الذکر تنظیموں کو امداد دینے سے ہاتھ کھینچ لیا اور صرف پاکستان نواز تنظیموں کی سرپرستی جاری رکھی۔

کشمیری عوام کو، جو کشمیریت کے نظریئے اور صوفی رشیوں کی تعلیمات پر پلے بڑھے تھے، جارح اسلام کی طرف کھینچنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ وادی میں ہندو اور مسلمان سالہاسال سے فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور خیر سگالی کے ساتھ زندگی بسر کررہے تھے اور ایک دوسرے کے غم وخوشی میں شریک ہوتے تھے۔ چھٹی دہائی میں پاکستان کا ایسا ہی منصوبہ ناکام ہوا تھا اور مابعد

جنگ میں اسے شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس لیے وہاں کے فوجی حکمرانوں نے اس بار کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔ جیسا کہ 'آپریشن ٹوپاک' سے پتہ چلتا ہے انھوں نے اس بارے میں کافی ہوم ورک کیا تھا۔ انھوں نے کشمیر کو اسلامی رنگ میں رنگنے کے لیے کئی تنظیموں کی مدد لی جن میں جماعت اسلامی، حزب المجاہدین، دختران ملت وغیرہ سرفہرست تھیں۔ ان تنظیموں نے کشمیر میں شریعت نافذ کرنے اور نظام مصطفیٰ قائم کرنے کا وعدہ کیا، سینما گھر اور ویڈیو پارلر جلا دیے، شراب اور منشیات کی دکانیں بند کر دیں، بیوٹی پارلر بند کیے اور خواتین کو حجاب پہن کر گھر سے نکلنے کا حکم جاری کیا۔ چند ایک بے پردہ خواتین پر تیزاب پھینکا گیا تاکہ دوسروں پر ہیبت طاری ہو۔ اس کے علاوہ لڑکیوں کے اسکولوں کو آگ لگا دی گئی تاکہ ان کی تعلیم پر روک لگ سکے۔ شہر کے سبھی اخباروں کو چیتاونی دی گئی کہ وہ مجاہدین کی خبریں نمایاں طور پر شائع کریں۔ ان میں سے کئی اخباروں میں ہر روز ڈرانے دھمکانے کی خبریں شائع ہوتی رہیں۔ ریاست میں ہلاکت کی اِکا دُکا وارداتیں روز کا معمول بن گئیں۔ نیز لوگوں میں خوف و ہراس پیدا کرنے کے لیے کئی افراد کو، جن کا کسی بھی طور ہندوستانی سیاست یا فوج سے کوئی وابستگی تھی، مخبر کا لیبل لگا کر موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ علاوہ ازیں کچھ سیاست دانوں، سرکاری افسروں، مذہبی رہنماؤں اور کشمیری پنڈت لیڈروں کو ہلاک کیا گیا۔ مرنے والوں میں کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر مشیر الحق، ایچ ایم ٹی فیکٹری کے جنرل منیجر ایچ ایل کھیڑا اور دوردرشن کے ڈائریکٹر لسہ کول شامل تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساری وادی میں خوف و دہشت پھیل گئی۔ ردِ عمل میں اخباروں میں ہزاروں لوگوں کے اشتہارات چھپنے لگے جن میں وہ کسی بھی سیاسی پارٹی یا ہندوستانی ایجنسی سے کوئی بھی تعلق نہ ہونے کا یقین دلانے لگے اور اس بات کا اعادہ بھی کرنے لگے کہ وہ کسی بھی صورت میں مخبری کرنے میں ملوث نہیں ہیں۔ ان اشتہارات کو پڑھ کر عام آدمی کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے کہ کہیں اس پر کوئی مخبری کا لیبل نہ لگا دے۔

(۱۸)

۱۹۸۷ء کے انتخابات کے دوران عبدالقادر بٹ سے بہت بڑی بھول چوک ہوگئی۔ اس نے الیکشن کے دوران مسلم یونائیٹڈ فرنٹ کے امیدواروں پر داؤں لگایا کیونکہ ان کی مقبولیت کو دیکھ کر ان کے جیتنے کے امکانات بے پایاں تھے۔ ماہرین انتخابی رجحانات کی بھی یہی رائے تھی کہ ایم یو ایف ۸۰ تا ۹۰ فیصدی حلقۂ انتخابات سے فتح حاصل کرے گی۔ عبدالقادر بٹ کا شیوہ تھا کہ وہ جیتنے والے گھوڑے پر ہمیشہ بازی لگاتا تھا۔ اس کی یہ کوشش رہتی تھی کہ سرکار کوئی بھی آئے، وہ اس کی مقروض رہے۔ اس نے اپنی جیب سے ایم یو ایف کے امیدواروں کو بیس لاکھ روپے بطور چندہ اور دس جیپیں مہیا کیں تاکہ وہ الیکشن میں اپنی مہم زور و شور کے ساتھ چلا سکیں۔

چنانچہ ریاست میں انتخابات کے دوران سرکار کی طرف سے ہیرا پھیری کرنے کا رواج عام ہے اس لیے جب نتیجے آئے تو حزب اختلاف کے امیدواروں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ روایت تو خیر ابتدا ہی سے چلی آ رہی ہے اور اس حمام میں سب ننگے ہیں، اس لیے کوئی کسی دوسرے پر الزام نہیں لگا سکتا۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس! البتہ ایم یو ایف پہلی بار انتخابات لڑ رہی تھی اس لیے انھیں یہ بات ہضم نہیں ہوئی۔

عبدالقادر بٹ جنگلات کا ٹھیکیدار تھا اور ماضی میں مختلف حکومتوں کے دوران بے انتہا کمائی کر چکا تھا۔ مذکورہ الیکشن سے کچھ روز پہلے اس نے سرکاری دست کاری کی اکائی کو قریباً چالیس لاکھ روپے کی اخروٹ کی لکڑی مہیا کی تھی جس کا بل ابھی تک پاس نہیں ہوا تھا۔ جیسا کہ ہوتا آیا تھا، عبدالقادر اکائی کو گیلی لکڑی سپلائی کرتا تھا جس کے سبب اس کا وزن اور حُجم دونوں قریباً دوگنا بڑھ جاتے تھے اور اس طرح اس کا نفع دوگنا ہو جاتا تھا۔ مگر اب تو اونٹ پہاڑ کے نیچے آ چکا

تھا۔نئی سرکار کے ایماپر اکائی کے افسر اس کے خلاف ہوگئے اور انھوں نے لکڑی خریدنے میں آنا کانی کرلی۔اس طرح وہ لکڑی سرکاری گودام میں سال بھر پڑی رہی۔اس دوران وہ مکمل طور پر سوکھ گئی اور اس کا نہ صرف وزن آدھا ہوگیا بلکہ اس کے حُجم میں بھی زمین آسمان کا فرق آگیا۔رقم کی ادائیگی بھی ایک سال تک رُکی رہی۔معاملہ عدالت تک پہنچ گیا اور عدالت کے حکم کے مطابق سرکار کو ثالث نامزد کرنا پڑا۔لکڑی کی دوبارہ پیمائش کرائی گئی جس کی وجہ سے عبدالقادر بٹ کو نہ صرف بیس لاکھ کا خسارہ اٹھانا پڑا بلکہ ڈیڑھ سال تک اس کا سرمایہ بے کار پڑا رہا۔یہ نقصان ان اخراجات کے علاوہ تھا جو اس نے چندے کی صورت میں اور دس جیپوں پر صرف کیے تھے۔اتنا ہی نہیں،سرکار نے اسے بغیر تحریری اجازت جنگلی درخت کاٹنے کا الزام لگایا اور اس کے خلاف ایف آئی آر داخل کرادی۔نیز اس کو جنگلات کی ٹھیکیداری کرنے کی اجازت نہیں تھی۔عبدالقادر کی حالت اتنی غیر ہوگئی کہ اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا،شکل وصورت سے اس کو پہچاننا مشکل ہوگیا اور دوست ورشتے دار سبھی نے اسے کنارہ کرلیا۔

دوسری طرف عبدالقادر کا بیٹا خالد بٹ،جو عیش وعشرت کا رسیا تھا،اس غیر متوقع تبدیلی کو برداشت نہ کرسکا۔وفور دولت کے باعث وہ دن رات شراب پیتا اور نشے میں چور رہتا تھا۔اس کے دوست بھی منشیات اور شراب کے خوگر تھے۔ہم جنس باہم جنس کند پرواز۔نشے کی حالت میں خالد بٹ نہ صرف اپنے باپ کو بلکہ ساری دنیا کو کوستا رہتا۔باپ کے نام پر جنگلات کے ٹھیکے ملنا بند ہوگئے اس لیے بیٹے نے اپنے نام سے درخواستیں بھیجنا شروع کردیں مگر والد کے بھاری خسارے کے بعد بڑے ٹھیکے لینا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔خالد بٹ کی ذہنی حالت ایسی ہوگئی کہ اگر اس کا بس چلتا تو ہر اس آدمی سے بدلہ لیتا جس نے اس کے والد کو برباد کرنے میں حصہ لیا تھا۔

یہ خبر جب شیریں ملِک کو ملی تو وہ بہت پریشان ہوگئی مگر ساتھ ہی اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے اپنی بیٹی کو اس دلدل سے بچالیا۔مہک ملک کے لیے تو یہ اطمینان بخش خبر تھی۔

منیر ملک کا تو خون کا رشتہ تھا، وہ بہت مایوس ہوا اور چاہتا تھا کہ خالد بٹ سے اس بارے میں بات کر لے اور اسے خود کو سنبھالنے کی ہدایت کرے۔ لیکن شیریں نے اسے یہ کہہ کر روک لیا کہ خالد اب بے قابو ہو چکا ہے اور اپنی حدوں سے تجاوز کر چکا ہے۔ کہیں وہ آپ کو کھری کھوٹی نہ سنائے جو آپ برداشت نہیں کر پائیں گے۔ منیر ملک نے اپنی شریک حیات کی بات پر کافی سوچ بچار کر لیا۔ چنانچہ اس نے خود بھی خالد بٹ کی کارکردگی کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا، اس لیے خاموشی اختیار کرنا ہی مناسب سمجھ لیا۔

عبدالقادر کی طبیعت اب خراب ہی رہتی تھی حالانکہ اس کی بیوی جمیلہ نے ہمت نہ ہاری۔ ذہنی فتور آنے کے باوجود وہ اپنے شوہر کی خدمت کرنے میں ایک وفا شعار بیوی کی طرح جٹی رہی۔ اسے سیاست اور بیوپار کے داؤ پیچ سمجھ نہیں آتے تھے تاہم وہ اپنے شوہر پر بھروسہ کرتی تھی اور ہر مرحلے پر اس کا ساتھ دیتی تھی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ کوئی گھڑی ایسی بھی آئے گی جب اس کا شوہر پیسے پیسے کا محتاج ہو جائے گا اور وہ خود کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہ جائے گی۔ اس کی امید کا چراغ، اس کا اکلوتا بیٹا خالد بچا تھا مگر وہ بھی خلاف توقع حرکتیں کرنے لگا تھا۔ وہ اب سیاسی میدان میں شدّت پسندوں کا ساتھ دے رہا تھا۔ ایم یو ایف سے وابستگی نے اسے جماعت اسلامی کے قریب کر دیا جس کے سبب اس پر مذہبی رنگ چڑھ گیا اور وہ عسکری تنظیموں کا حمایتی بن گیا حالاں کہ نشے اور شراب کی لت سے چھٹکارا پانا اس کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ اللہ کا شکر تھا کہ خالد سے بڑی تین بیٹیوں کی شادی ہو چکی تھی ورنہ نہ جانے ان کا کیا انجام ہوتا۔ جمیلہ اپنے بیٹے کو سمجھانے کی بہت کوشش کرتی رہی مگر وہ اتنا ہی ڈھیٹ ہوتا جا رہا تھا۔ نہ شراب و منشیات میں کمی ہو رہی تھی اور نہ ہی تجارت میں کوئی سدھار ہو رہا تھا۔

خالد بٹ کو زندگی میں دو بار زبردست دھچکے کھانے پڑے تھے۔ ایک اس وقت جب اس کو اپنی ممیری بہن نے ٹھکرا دیا تھا اور دوسرا جب اس کے والد کو تجارت میں غیر متوقع نقصان اٹھانا پڑا تھا جس کے سبب عبدالقادر ذہنی توازن کھو بیٹھا۔ پہلے دکھ کا کوئی مداوا نہ تھا

کیونکہ گھڑی کی سوئی واپس نہیں گھوم سکتی تھی۔ میری بہن جلدی ہی ڈاکٹر بننے والی تھی جبکہ وہ تعلیم میں بہت پیچھے رہ گیا تھا اور جنگلات کی معمولی سی ٹھیکیداری پر اکتفا کرنے کے لیے مجبور تھا۔ اس ضرب کی وجہ سے اس کے دل میں بہت گہرا زخم ہو چکا تھا جو اسے بار بار پریشان کر رہا تھا۔ نتیجتاً وہ لمحہ بہ لمحہ انتقام کی آگ میں جل رہا تھا۔ جہاں تک پیشے کا سوال تھا ابتدا میں وہ کافی بوکھلایا سا نظر آیا مگر آہستہ آہستہ اس نے حالات کے ساتھ سمجھوتا کر لیا اور دوبارہ برسراقتدار سیاست دانوں اور سرکاری افسروں سے تعلقات بحال کرنے کی تگ و دو کرنے لگا۔ چھوٹے موٹے کنٹریکٹ تو ملنے لگے مگر اس کی سیاسی وابستگی کی افواہیں ان لوگوں تک بھی پہنچ گئیں اور وہ چوکنا ہو گئے۔ ان میں سے کوئی بھی اپنی کرسی گنوانا نہیں چاہتا تھا اس لیے خالد سے حتی المقدور پہلوتہی کر رہے تھے۔

چونکہ خالد بٹ کو زیادہ کام نہیں مل پا رہا تھا اس لیے وہ سرکاری نظام سے جنون کی حد تک بدظن ہو گیا۔ اس کا زیادہ تر وقت سیاسی سرگرمیوں میں صرف ہونے لگا۔ جس سیاسی پارٹی کے ساتھ وہ جڑ گیا تھا اس میں جسے دیکھو وہ موجودہ نظام کے خلاف تھا اور ہندوستانی تسلط سے آزادی کا خواہاں تھا۔ عوامی انصاف پارٹی ایسے نظام کے حق میں تھی جہاں شرعی قانون لاگو ہو، شراب اور نشہ پر پابندی ہو اور عورت خودسر نہ ہو بلکہ مرد کے رحم و کرم پر ہو۔ یہ بات الگ کہ وہ خود نشے اور شراب کا عادی تھا۔ پارٹی کے دفتر میں وہ دوسرے ممبران کی ہاں سے ہاں ملاتا رہتا اور بڑے جوش و خروش کے ساتھ اس نظام کی آمد کا انتظار کرتا تھا جس کا وعدہ اس کی پارٹی کر رہی تھی۔

(۱۹)

دیکھا جائے تو کشمیر میں ایسی کئی جماعتیں تھیں جو تقسیم وطن کے بعد حریت اور آزادی کی باتیں کرتی تھیں۔ ان میں سب سے زیادہ فعال مولوی محمد فاروق کی عوامی ایکشن کمیٹی اور حریت کانفرنس تھی۔ مولوی محمد فاروق مسلم کانفرنس کے سربراہ مولوی یوسف شاہ کے جانشینوں میں سے

تھے۔ دراصل جب ۱۹۴۷ء میں مذہب کی بنیاد پر بٹوارہ ہوا اور اسلامی ملک پاکستان وجود میں آیا اس وقت جموں و کشمیر کا مہاراجہ ہری سنگھ ابتدائی لیت ولعل کے بعد قبائلی حملے کے پیش نظر ہندوستان کے ساتھ الحاق کرنے پر مجبور ہوگیا۔ باوجودیکہ پاکستان نے کشمیر میں لشکرکشی کی مگر اس کے ہاتھ ناکامی آئی لیکن اقوام متحدہ کی مداخلت کے سبب وہ جموں و کشمیر کے ایک بڑے حصے پر قابض ہوگیا جسے پاکستانی حکمرانوں نے 'آزاد کشمیر' کا نام دیا۔ علاوہ ازیں جموں و کشمیر کے گلگت بالتستان علاقے کو پاکستان نے الگ کرکے بالراست اپنے ساتھ ملا دیا۔

جموں و کشمیر میں اس زمانے میں کئی مسلم رہنما تھے جو ڈوگرہ حکومت سے آزادی حاصل کرنے کی خاطر تحریک چلا رہے تھے۔ ان میں سے جو رہنما مظفر آباد کے پاس پڑوس میں رہتے تھے انھوں نے پاکستانی مقبوضہ کشمیر کو اپنا مستقر بنا لیا۔ اِدھر وادی کشمیر میں ایک جانب مسلم کانفرنس کا رہنما مولوی یوسف شاہ تھا، جو پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے کے حق میں تھا، اس نے بھی پاکستانی مقبوضہ کشمیر جا کر وہیں سکونت اختیار کرلی۔ دوسری جانب نیشنل کانفرنس کا رہنما شیخ محمد عبداللہ تھا جس نے ہندوستان کے ساتھ مشروط الحاق کرنے پر رضامندی ظاہر کی۔ جنگ بندی کے بعد مہاراجہ ہری سنگھ سبکدوش ہوگیا اور شیخ محمد عبداللہ نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔ چند برسوں کے بعد جب ہندوستان جمہوری نظام بن گیا اور دستور نافذ ہوا، جموں و کشمیر کے لیے آئین میں دفعہ ۳۷۰ شامل کیا گیا۔ اس کے علاوہ ریاست کا اپنا ایک الگ دستور رائج ہوا، ایک الگ 'ہل والا' جھنڈا اختیار کیا گیا، گورنر کے بدلے صدر ریاست اور وزیر اعلیٰ کے بدلے وزیر اعظم کا عہدہ قائم کیا گیا۔ اس طرح جموں و کشمیر کو ایک الگ حیثیت مل گئی جو باقی ریاستوں سے مختلف تھی۔

شیخ محمد عبداللہ دوشاخہ شخصیت کا مالک تھا، ایک طرف وہ اسلامی طرز زندگی پر مکمل یقین رکھتا تھا اور دوسری طرف کمیونسٹ نظریے سے کافی متاثر تھا یہاں تک کہ اس نے 'نیا کشمیر' کا منشور ایک کمیونسٹ لیڈر بابا پیارے لال بیدی اور اس کی زوجہ فریڈا بیدی سے قلم بند کرایا تھا۔ اس کی

قیادت میں جموں وکشمیر ہندوستان کی پہلی ریاست بن گئی جہاں زرعی اصلاحات نافذ کیے گئے اور زمینداری ختم کر کے کاشتکاروں میں زمینیں بانٹی گئیں ۔ چنانچہ ڈوگرہ حکومت کے دوران اکثر زمینوں وجاگیروں کے مالک ہندو بن چکے تھے اس لیے ان اصلاحاتِ اراضی کے خلاف جموں صوبے میں پرجا پریشد نے آواز اٹھائی جس کی صدائے بازگشت دہلی کے ایوانوں میں سنائی دی۔ شیخ محمد عبداللہ کو دہلی بلایا گیا اور اس بارے میں جواب طلبی کی گئی۔ نتیجے میں وہ خفا ہو گیا اور واپسی پر رنبیر سنگھ پورہ میں اس نے مرکزی حکومت کے خلاف زہر اگلا جس کی وجہ سے کچھ وقفے کے بعد اسے نظر بند کیا گیا اور جموں وکشمیر میں بخشی غلام محمد کی سرکار بن گئی۔

انجام کار کشمیر میں ایک طرف شیخ محمد عبداللہ کے پیرو خود مختاری کے نعرے لگانے لگے اور جموں وکشمیر کو آزاد و خود مختار ملک بنانے کے سپنے دیکھنے لگے اور دوسری طرف وہ قوتیں دوبارہ سر اٹھانے لگیں جو گذشتہ کئی سالوں سے مخفی تھیں کیونکہ ان کا آقا مولوی یوسف شاہ پاکستانی مقبوضہ کشمیر نقل مکانی کر چکا تھا۔ یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہا، شیخ محمد عبداللہ برسوں جیلوں میں رہا، کبھی مختصر مدت کے لیے چھوڑا جاتا اور پھر دوبارہ قید کیا جاتا۔

اُدھر پاکستانی فوجی حکومت اس تاک میں بیٹھی تھی کہ وہ جموں وکشمیر کو یکسر ہندوستان سے چھین کر پاکستان میں ملا دے، آدھے حصے پر تو انھوں نے قبائلی حملے کی وساطت سے قبضہ جما ہی لیا تھا مگر ابھی آدھا حصہ ہندوستان میں شامل تھا۔ انھوں نے کئی بار مقامی تنظیمیں جیسے الفتح بنوا کر انھیں عسکری کارروائیوں کے لیے اکسایا مگر ناکام رہے۔ چونکہ ۱۹۶۲ء میں ہندوستان کو چین کے ہاتھوں زبردست شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا، اس لیے پاکستانی حکمران اس موقعے کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتے تھے۔ حوصلہ پا کر انھوں نے ۱۹۶۵ء میں سِوِل لباس میں باضابطہ تربیت یافتہ فوجی شب خون مارنے کے لیے جموں وکشمیر ریاست کے اندر بھیج دیے۔ یہ مہم جنگ میں تبدیل ہو گئی۔ دونوں طرف سے کافی جانی و مالی نقصان ہوا تاہم کچھ حد تک پلڑا ہندوستان کی طرف بھاری رہا۔ روس کی پہل پر تاشقند میں امن بحال کرنے کے لیے لال بہادر شاستری اور

جنرل ایوب خان کے درمیان مذاکرات ہوئے جس کے باعث جنگ تو بند ہوئی مگر کوئی دائمی حل نہیں نکل پایا۔ اس پر بدقسمتی یہ رہی کہ ہندوستان کے وزیر اعظم، لال بہادر شاستری تاشقند میں ہی دل کا دورہ پڑنے کے سبب راہ عدم اختیار کر گئے۔

۱۹۷۱ء میں ہندوستان نے صرف چودہ دن میں فوجی کارروائی کر کے بنگلہ دیش کو پاکستان کے تسلط سے آزاد کرایا۔ اس جیت کے چند ضمنی نتائج بھی برآمد ہوئے۔ ایک تو یہ کہ شیخ محمد عبداللہ کو یہ تسلی ہوئی کہ اس کی ہٹ دھرمی کسی کام کی نہیں اس لیے اس نے مرکزی حکومت سے سمجھوتا کر لیا اور جموں و کشمیر کی باگ ڈور پھر سے سنبھالی۔ دوسرے یہ کہ مشرقی حصہ، جو بنگلہ دیش بن گیا، وہ پاکستان کے لیے اقتصادی و انصرامی طور پر ایک ناسور بن چکا تھا، اس لیے بنگلہ دیش کے الگ ہو جانے سے اس کا یہ ناسور دائمی طور پر ختم ہوا۔ قریباً ترانوے ہزار فوجی جو مشرقی سرحد پر تعینات تھے اب مغربی سرحدوں پر دستیاب ہو گئے۔ پاکستانی فوجی سربراہ، جو احساس کمتری سے غلطاں و پیچاں تھے، ہندوستان کے خلاف نئی نئی سازشیں رچنے لگے۔ پہلے تو انھوں نے ہندوستانی پنجاب میں خالصتان کی تحریک کو ہوا دی تا کہ مشرقی پنجاب کا بھی وہی حال کیا جائے جو مشرقی پاکستان کا ہوا تھا۔ یہاں انھیں کامیابی نہیں ملی۔ ۱۹۸۹ء میں پاکستانی فوج نے امریکی حمایت پا کر طالبان کے توسل سے سوویت روس کو افغانستان چھوڑنے پر مجبور کیا۔ اس کامیابی نے پاکستانی فوج میں ایک نئی روح پھونک دی اور ان کی کوششیں پھر سے کشمیر پر مرکوز ہو گئیں۔ جنرل ضیاالحق نے 'آپریشن ٹوپاک' کے تحت کشمیر آزاد کرانے کے لیے لائحہ عمل تیار کیا۔ اس کے مطابق کشمیر میں پہلے جماعت اسلامی کے توسط سے تبلیغ کے ذریعے کشمیریوں کو جارح اسلام کی تعلیم دینے کا بندوبست کرنا تھا۔ دوسرے، ریاست کے انتظامیہ میں ایسے تربیت یافتہ لوگوں کی اکثریت پیدا کرنی تھی جو بروقت انتظامیہ کو مفلوج کر سکتے تھے۔ تیسرے مرحلے پر کشمیری پنڈتوں کو کشمیر سے نکال باہر کرنا تھا تا کہ وادی میں کوئی ہندوستان نواز نہ رہے۔ آخر میں ہندوستانی افواج کے ساتھ بالراست مقابلہ آرائی تھی۔

اس پس منظر میں دیکھا جائے تو جن دنوں خالد بٹ عوامی انصاف پارٹی سے جڑ گئے اس وقت آپریشن ٹوپاک پر عمل شروع ہوا تھا اور وہ بھی اس سے متاثر ہو گیا تھا۔ ماضی کی صعوبتوں کے سبب وہ اپنی ذاتی کشمکش کو اجتماعی کشمکش میں منقلب کرنا چاہتا تھا۔ اس نے رفتہ رفتہ ایک فعال ورکر کی طرح اس آپریشن کو کامیاب بنانے میں اپنا رول ادا کیا۔

(۲۰)

۱۹۹۰ء میں کشمیری پنڈت براہ راست دہشت گردی کی چپیٹ میں آگئے۔ اس سے پہلے بھی چنندہ کشمیری پنڈتوں کو ہلاک کیا جاتا رہا مگر اب کوئی بھی اور کہیں بھی اس خونریزی کی زد میں آرہا تھا۔ ایک تخمینے کے مطابق کم سے کم ایک ہزار کشمیری پنڈت جاں بحق ہو گئے۔ یہ تعداد تین لاکھ نفوس پر مشتمل اس چھوٹی سی قوم کے لیے بعید القیاس تھی۔ وادی میں آئے دن احتجاجی جلوس نکلتے تھے جن پر اکثر پولیس کارروائی کرتی تھی۔ جلوس کے منتظمین کشمیری پنڈتوں کو گھر سے زبردستی نکال کر ان جلوسوں کی صف اول میں چلنے پر مجبور کر دیتے تا کہ پولیس گولی چلانے سے احتراز کرے۔ اس پر بھی اگر پولیس گولی چلاتی یا لاٹھی چارج کرتی تو یہی لوگ مارے جاتے۔ اس حکمتِ عملی سے دو مقاصد پورے ہونے کی امید تھی، ایک یہ کہ کشمیری پنڈت قوم خوف زدہ ہو کر وادی چھوڑ کر بھاگ جاتی یا پھر قربانی کا بکرا بن جاتی۔ اتنا ہی نہیں، کشمیری پنڈتوں کو وادی چھوڑنے کے لیے باضابطہ طور پر لاوڈ اسپیکروں پر اعلان کیا گیا اور مقامی اخباروں میں دھمکیاں شائع کی گئیں۔ خوف و دہشت کی وجہ سے اس مٹھی بھر قوم نے فرار ہونے میں ہی اپنی بھلائی سمجھی۔

اس طرح وہ رات آ ہی گئی جس کا عسکری تنظیموں نے باقاعدہ منصوبہ بنایا تھا۔ ۱۹/اور ۲۰ر جنوری ۱۹۹۰ء کی درمیانی رات میں کشمیر کی وادی رات بھر شورش کی زد میں آگئی۔ ایک سوچے سمجھے پلان کے تحت وادی میں اکثر مسجدوں کو دہشت گردوں نے قبضہ کر لیا۔ جن لاؤڈ اسپیکروں

پر اذان گونجتی تھی ان پر ریکارڈ شدہ کیسٹ لگا کر رات بھر آزادی کے نعرے گونجتے رہے۔ ان نعروں میں کشمیر کی آزادی اور نظام مصطفیٰ کی بحالی کے علاوہ کشمیری پنڈتوں کو وادی چھوڑنے کی تاکید کی جا رہی تھی۔ نعرے چہار سو ایسے گونج رہے تھے کہ معلوم ہو رہا تھا رات کی تاریکی میں لاکھوں لوگ سڑکوں پر اتر آئے ہیں اور ہندوستانی فوج کو للکار رہے ہیں۔ نیز کشمیری پنڈتوں کو وادی سے نکلنے کی دھمکیاں دی جا رہی تھیں اور یہ باور کرایا جا رہا تھا کہ اگر وہ کچھ دنوں میں وادی چھوڑ کر نہیں جاتے تو ان کو نیست و نابود کیا جائے گا۔ یہ تو اس مہم کی انتہا تھی جو کچھ مہینوں سے وادی میں چلائی جا رہی تھی۔ نتیجے میں نہتے بے یار و مددگار کشمیری پنڈت اپنے بند کمروں میں رات بھر اضطراب میں سانسیں گنتے رہے اور اس دہشت ناک قابوس کا سامنا کرتے رہے۔ اسی رات انھوں نے وادی سے ہجرت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اگلے روز سے ان کا وسیع پیمانے پر خروج شروع ہو گیا۔ ہاں کہیں کسی جگہ اکّا دکّا کشمیری پنڈتوں نے نقل مکانی کرنا مناسب نہیں سمجھا اور اپنی دھرتی پر جمے رہے جن میں اکثر لوگ عمر رسیدہ تھے۔

اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ کشمیری پنڈت عسکری قوم نہیں ہے اور نہ ہی وہ اس خون خرابے کے لیے تیار تھی۔ اس لیے جس کو جو کچھ ملا وہ اس نے سمیٹ لیا اور اپنے کنبے کو لے کر وادی سے ہجرت کر لی۔ تینتالیس برس پہلے ملک کے بٹوارے کے وقت جس خون ریزی، عصمت دری اور آتش زنی کا کھیل کھیلا گیا تھا، اس کی دوسری قسط اب پیش کی جا رہی تھی۔ کشمیری پنڈت جوق در جوق وادی سے نقل مکانی کر کے بسوں، ٹرکوں اور دیگر ٹرانسپورٹ کے ذریعے جموں کی طرف روانہ ہو گئے۔ کسی نے پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا کہ وہ کیا چھوڑ کے جا رہا ہے۔ چنانچہ بہت سارے کشمیری پنڈت سرکاری ملازم تھے، انھوں نے نوکریوں کی پرواہ نہ کر کے جموں کی راہ لی اور اس طرح سرکاری دفاتر ملازموں سے خالی ہو گئے۔ کشمیر سے انخلا کے وہ مناظر دردناک اور دلسوز تھے۔ لوگ لاکھوں کی تعداد میں جموں پہنچ گئے مگر جموں سے آگے کہاں جانا ہے انھیں معلوم نہ تھا۔ سارے شہر میں رفیوجیوں کا تانتا بندھ گیا۔ سرکار بس تماشائی بن کر رہ گئی۔ زیادہ تر لوگوں نے

مقامی مندروں میں پناہ لی۔ جوان مرد، خوبصورت عورتیں، شیر خوار بچے، ہانپتے کانپتے بوڑھے، لنگڑے لولے و بیمار اپاہج سب سر چھپانے کے لیے دوڑ دھوپ کر رہے تھے۔ ہر طرف پراگندگی کا عالم تھا۔ شوروغل اتنا کہ ایک دوسرے کی بات سنائی نہیں دے رہی تھی۔

کچھ دنوں کے بعد سرکاری اور غیر سرکاری اداروں نے ان شرنارتھیوں کی باز آباد کاری کی کوششیں کیں۔ ہندوستان کے طول و عرض سے امداد پہنچنے لگی۔ ٹینٹ، اشیائے خوردنی، کھانا بنانے کے لوازمات، کپڑے لتے اور اوڑھنے بچھونے کے لیے دریاں، چادریں اور کھیس وغیرہ۔ پناہ گزیں ان چیزوں پر ایسے ٹوٹ پڑتے جیسے کل آئے گا ہی نہیں۔ روتی بلکتی مائیں، گرمی سے نڈھال بوڑھے، نوالوں کو ترستے بچے۔ جو لوگ سرکاری یا سرکاری اکائیوں میں ملازم تھے ان کا دوسری ریاستوں میں تبادلہ کیا گیا۔ انھیں مجبور ہو کر دور دراز علاقوں میں جا کر نوکری کرنی پڑی۔ زیادہ تر لوگ وہ تھے جو سرکاری ملازم نہ تھے بلکہ کشمیر میں دیہی علاقوں میں کھیتی باڑی پر گزارا کرتے تھے یا کچھ لوگ تجارت پر منحصر تھے، ایسے لوگوں کے لیے کئی جگہوں پر رفیوجی کیمپ قائم کیے گئے۔ کچھ لوگوں کو اسکولوں اور نیم تعمیر ہوئی سرکاری عمارتوں میں پناہ دی گئی۔ ریاستی سرکار نے، جو اس وقت گورنر چلاتا تھا، ان شرنارتھیوں کے لیے راشن وغیرہ کا انتظام کرایا اور ہر کنبے کے لیے ماہوار مالی امداد دینے کا فیصلہ کر لیا۔ کشمیری پنڈتوں کے لیے یہ دورانیہ قابوس سے کم نہ تھا۔ انھوں نے کبھی ایسے بھیانک مناظر خواب میں بھی نہیں دیکھے تھے۔

جڑوں سے اکھڑے لوگ...!

اپنی ریتی رواج اور رسموں سے کٹے ہوئے...!

اجنبی جگہ... اجنبی لوگ... اجنبی ماحول...!

حالت فنا میں حتمی معدومیت کی جانب گامزن...!

وقت کے ساتھ ساتھ گرمیاں بھی بڑھتی چلی گئیں اور درجہ حرارت چالیس اکتالیس تک پہنچ گیا۔ ان ناچار و عاجز پناہ گزینوں نے زندگی بھر اتنی شدید گرمی نہیں دیکھی تھی۔ جن خیموں میں

رہتے تھے وہاں دن رات شعلے برس رہے تھے۔ جو عورتیں موٹے موٹے پھرن پہن کر وادی میں گھوما پھرا کرتی تھیں وہ قریب قریب عریاں نظر آرہی تھیں۔ ایک ایسی قوم جو شرم وحیا کی زندگی بسر کرنے کو ترجیح دیتی تھی آج پیسے پیسے کے لیے محتاج ہوگئی تھی۔ سرکاری اور نیم سرکاری امداد لینے کیلئے جھلستی گرمی میں لمبی لمبی قطاروں میں کھڑا ہونا پڑتا تھا۔ اتنا ہی نہیں، گرمی کا موسم آتے ہی پانی کی قلت ہونے لگی اور پیاسے شرنارتھی بوند بوند کے لیے ترسنے لگے۔ خیموں میں آہستہ آہستہ پنکھے لگائے گئے مگر بجلی آٹھ میں سے چار پہر گُل رہتی تھی۔ کسی کو سمجھ نہیں آرہا تھا کہ اس کا مداوا کیا ہے۔ سب آسمان کی طرف دیکھتے اور بنانے والے سے من ہی من میں پوچھتے کہ بتاؤ ہم نے کیا قصور کیا ہے؟

رفتہ رفتہ ان پناہ گزینوں کی قطاریں ہسپتالوں کے باہر نظر آنے لگیں۔ ذہنی انتشار کے سبب اکثر مائیگرنٹ ذیابیطس میں مبتلا ہوگئے۔ یہ بیماری تو انسانی جسم کو کرید کرید کر کھوکھلا کردیتی ہے۔ اس کے علاوہ بلند فشار خون اور امراض قلب کی شکایتیں بھی روز بروز بڑھتی گئیں۔ کئی لوگ تپش اور انتشار کی وجہ سے ذہنی اختلال کے شکار ہوگئے۔ کہیں کہیں سے سانپ اور بچھو کے کاٹنے اور سرطان سے مرنے کی خبریں بھی آنے لگیں۔

بہر حال اس پیڑھی نے، جو جوان تھی اور جن پر ایک طرف ماں باپ کا بوجھ تھا اور دوسری طرف بچوں کی پرورش کی ذمہ داری، ان سب مصائب کے باوجود ہمت نہیں ہاری۔ انھوں نے انسانیت سوز حالات میں بھی اپنے بچوں کو تعلیم کی روشنی سے منور کرنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں اکثر کامیاب ہوئے۔ چنانچہ سرکار نے شرنارتھی بچوں کے لیے مائیگرنٹ اسکول کھولنے کا انتظام کیا اور ان اسکولوں میں وادی سے آئے مائیگرنٹ استادوں کو ایڈجسٹ کیا اس لیے تعلیم حاصل کرنے میں کوئی زیادہ مشکل نہیں آئی۔

اُدھر مہاراشٹر میں شیوسینا کے سربراہ بال ٹھاکرے نے ان مہاجروں کی پریشانیوں کے بارے میں سن کر مہاراشٹر کے پیشہ ورانہ کالجوں میں کشمیری مائیگرنٹوں کے لیے ریزرویشن مختص کرائی اور اس طرح کم نمبرات لے کر بھی مائیگرنٹ طالب علموں کو انجینئرنگ، ہوٹل منیجمنٹ اور

دیگر کورسز میں داخلہ مل گیا۔ ماں باپ نے اپنا پیٹ کاٹ کر بچوں کو جموں سے باہر کالجوں میں بھیج دیا اور ان کو اعلیٰ تعلیم دلوائی ۔ بعد میں دیگر ریاستی سرکاروں نے بھی مہاراشٹر کی طرز پر کشمیری مائیگرنٹوں کے لیے پیشہ ورانہ کالجوں میں ریزرویشن کا اعلان کر دیا۔ اس طرح دھرتی کے ان لالوں نے اپنی زمین تو کھوئی مگر اپنی ہمت اور حوصلہ نہیں کھویا اور وقت کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنے لیے نئے افق تلاش کیے۔ نئے نئے روزگار دستیاب ہونے کے سبب اب کشمیری پنڈت سرکاری نوکریوں کے پیچھے پڑنے کے بجائے پرائیویٹ کمپنیوں میں اپنا نام روشن کرنے لگے یہاں تک کہ کئی جیالوں نے اپنی کارجوبانہ قابلیت کا بھی مظاہرہ کیا۔

(۲۱)

باوجودیکہ کشمیری پنڈت وادی چھوڑ کر ہجرت کر گئے مگر کئی ایسے بھی تھے جو اپنی دھرتی کے ساتھ جڑے رہے گو ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی۔ ان میں وہ لوگ زیادہ تھے جو ریٹائرڈ زندگی بسر کر رہے تھے اور اب انھیں جینے مرنے کی کوئی چنتا نہ تھی۔ البتہ ان کے بچے میٹرو شہروں یا بیرونی ممالک میں نوکری کر رہے تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو غربت کے سبب یہ طے نہیں کر پا رہے تھے کہ وہ باہر جا کر کیا کریں گے۔ یہاں پر ان کے کھیت کھلیان تھے اور دو چار مویشی پال بھی رکھے تھے، کم سے کم پیٹ تو پل رہا تھا۔ پھر گوتم سپرو جیسے آدمی بھی تھے جن کو ان کے پیار نے اس دھرتی کے ساتھ باندھ رکھا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ نقل مکانی نہیں کرے گا۔

جے کشوری نے گوتم سے گھر بسانے کے بارے میں کچھ کہنا ہی چھوڑ دیا۔ وہ تو اس حوالے سے بہت نراش ہو چکی تھی اس لیے اب زیادہ تر وقت پوجا پاٹ میں گزارتی تھی۔ اس کی ذہنی پریشانیوں کو گوتم سمجھ نہیں پا رہا تھا کیونکہ وہ ان کا اظہار کرنے سے پرہیز کرتی تھی۔ اس کا ماننا

تھا کہ اس کا بیٹا جس بات میں خوش رہے گا وہی اس کے لیے اچھا ہے۔

ایک رات جے کشوری کے شکم میں بہت شدید درد اٹھا۔ کشمیر کے حالات کے سبب بہت سارے ڈاکٹر ہجرت کر چکے تھے، کچھ عدم تحفظ کے سبب دوسرے شہروں میں منتقل ہو چکے تھے اور کچھ بہتر کمائی کے لیے خلیجی اور یورپی ممالک چلے گئے تھے۔ دہشت گردی کی وجہ سے وادی میں شعبۂ صحت تباہ ہو چکا تھا۔ گوتم سپرو نے ٹیلی فون پر کئی اسپتالوں سے رابطہ قائم کیا مگر ناکام رہا۔ آخر کار ایک پرائیویٹ نرسنگ ہوم سے رابطہ ممکن ہوا اور ان کی ایمبولنس میں جے کشوری کو وہاں پہنچا دیا گیا۔ نرسنگ ہوم میں لیڈی ڈاکٹر نے جے کشوری کا معائنہ کیا، کئی ٹیسٹ کرائے اور فوری طور درد کم کرنے کی کچھ دوائیاں دیں۔ دو دنوں تک مرض کی تشخیص ہوتی رہی اور گوتم کو خبر دی گئی کہ اس کی ماں رحم کے کینسر میں مبتلا ہے۔ چنانچہ کینسر ایڈوانسڈ اسٹیج پر تھا اس لیے کوئی علاج کارگر نہیں ہو سکا۔ ڈاکٹروں سے جتنا ہو سکا مریض کی تیمارداری کی، اس کو کیموتھریپی بھی دی گئی مگر اسے بچنا تھا اور نہ بچ پائی۔ آخر کار جے کشوری نے اپنی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند کر لیں۔

گوتم سپرو اب بالکل اکیلا پڑ گیا۔ وہ دن بھر گھر میں بیٹھا رہتا۔ اس کا اسکول سرکاری کرفیو، سوِل کرفیو، ہڑتالوں اور دہشت گردی کی وارداتوں کے باعث اکثر بند رہتا۔ یا یوں سمجھ لیجیے کہ اساتذہ صرف تنخواہ لینے کی غرض سے پہلی تاریخ کو اسکول میں حاضر ہو جاتے جبکہ طلبہ ہمیشہ ہی غیر حاضر رہتے۔ دن تو جوں توں کٹ جاتے مگر راتیں گوتم کے لیے بھاری پڑ جاتیں۔ نیند نہ جانے کہاں غائب ہو چکی تھی۔ اس کو اپنے ماں باپ کی بہت یاد آتی اور وہ خون کے آنسو بہاتا رہتا۔

اُدھر مہک ملک نے ایم ڈی مکمل کر کے دہلی ہی میں نوکری کرنے کو ترجیح دی کیونکہ وہاں جدید سے جدید تر طبی ساز و سامان دستیاب تھا اور بڑے سے بڑے تجربہ کار ڈاکٹروں کی سرپرستی میں کام کرنے کے مواقع فراہم تھے۔ پیشہ ورانہ زندگی کے ابتدائی دور میں دہلی میں تجربہ حاصل کرنے کے روشن امکانات تھے۔ مہک کو جب گوتم کی ماں کی رحلت کی خبر ملی وہ بہت

پریشان ہوگئی۔ کشمیر کے حالات کے بارے میں اسے روزانہ دوردرشن اور قومی اخبارات سے جانکاری ملتی رہتی تھی۔ نیز یہ بھی ایک وجہ تھی کہ وہ دہلی میں اپنے قیام کو طول دے رہی تھی۔ مہک گوتم کو اپنے خطوط کے ذریعے حوصلہ رکھنے کی تلقین کرتی اور بعض اوقات اس کو ٹیلی فون پر بھی دلاسہ دینے کی کوشش کرتی۔ ''گوتم، تم نے یہ کیا حال بنا رکھا ہے۔ تمہارے خطوط سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ تم ہمت ہار بیٹھے ہو۔ تم تو دوسروں کو جینے کا سلیقہ سکھاتے تھے۔ کہتے تھے کہ زندگی مصیبتوں سے لڑنے کا نام ہے نہ کہ ان کے سامنے ہاتھ کھڑا کرنے کا۔ پھر یہ کیا ہے۔ خود ہی ہمت ہار بیٹھے ہو۔''

''مہک، میں اکیلا پڑ گیا ہوں، پاپا بھی چلے گئے اور ممی بھی۔ دو بہنیں ہیں، وہ ہجرت کر کے جموں چلی گئیں اور وہاں زندگی کی جدوجہد میں مصروف ہوگئیں۔ ابھی تو میں اکتیس برس کا ہوں مگر سوچ کر ہی لرزتا ہوں کہ نہ جانے آگے کیا کچھ دیکھنا پڑے گا۔''

''میں تمھاری ذہنی حالت سمجھ سکتی ہوں۔ تم جموں کیوں نہیں چلے جاتے؟ وہاں کا ماحول بہتر ہے۔ وہاں تمھارے رشتے دار بھی ہیں۔ سکھ دکھ میں تمھارا ساتھ دے سکتے ہیں۔''

''میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آتا، میرا دماغ تو مفلوج ہوگیا ہے۔ کشمیر سے کہیں اور جانا میرے لیے ممکن نہیں ہے۔''

''جن دنوں میں زیر تربیت تھی میں دہلی میں سیٹل ہونا چاہتی تھی اور میں نے تمھیں بھی یہاں آنے کی درخواست کی تھی مگر تم نے جواباً لکھا تھا کہ میں ماں کو اکیلے چھوڑ کر نہیں آسکتا۔ اس کے برعکس تم نے مجھے سرینگر واپس آنے پر اصرار کیا تھا اور لکھا تھا کہ میں اپنی دھرتی پر اور اپنے لوگوں کے بیچ رہ کر ان کی خدمت کروں، یہی میری زندگی کا نصب العین ہونا چاہیے۔ تمھارا وہ مشورہ مجھے بار بار اُکساتا رہا۔''

''نہیں نہیں مہک، تم مجھے غلط سمجھ رہی ہو۔ میرا یہ مطلب قطعی نہیں ہے۔ میں خود اپنی زندگی سے بے زار ہوگیا ہوں۔ ایسا لگتا ہے کہ میرا یہ جنم بے کار ہوگیا ہے۔''

"گوتم، معلّمی تو تمھاری چوائس تھی اور وہ بھی اپنی ہی دھرتی پر۔ تم نے خود ہی میتھس سبجیکٹ چن لیا تھا جبکہ فزکس اور کیمسٹری میں بڑے بڑے اداروں میں تمھیں بہت سارے مواقع مل سکتے تھے۔ اب اتنے برس بعد تم اتنے پشیماں کیوں دکھائی دیتے ہو۔"

"تمھاری بات صحیح ہے۔ تمھیں تو معلوم ہے کہ میتھس کے ساتھ میرا موروثی لگاؤ تھا۔ میرے پتا جی اس سبجکٹ میں ماہر تھے۔ میں بھی انہی کے نقش قدم پر چلنا چاہتا تھا۔ رہی بات دوسرے مضامین کی، اگر میں نے ان میں سے کسی ایک میں ایم ایس سی کیا ہوتا تب بھی اپنی دھرتی کو چھوڑ کر کہیں اور ملازمت کرنا ممکن نہ تھا کیونکہ گھر میں ماں اکیلی تھی۔ اس وقت مجھے یہ گماں بھی نہ تھا کہ ممی اتنی جلدی مجھے چھوڑ کر چلی جائے گی۔"

"گوتم، قسمت کے لکھے پر تمہارا اور میرا کوئی اختیار نہیں ہے۔ میں تمھارے عزم مصمم سے آگاہ ہوں اور تمھیں یہ کہہ کر توہین نہیں کرنا چاہتی پھر بھی وقت کی نزاکت کو دیکھ کر التجا کرتی ہوں کہ اب بھی وقت ہے تم میری فکر کرنا چھوڑ دو اور اپنی شادی رچاؤ کیونکہ زندگی کبھی کبھی ناقابل برداشت ہو جاتی ہے۔"

ٹیلی فون پر دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔ مہک خود ہی سمجھ گئی اور اپنے کہے پر شرمندہ ہوگئی۔ اس نے موضوع بدلنے میں ہی اپنی بھلائی سمجھی۔ آگے بھی مہک ہر رات بہت دیر تک گوتم کے ساتھ باتیں کرتی رہتی اور اس کو بھروسہ دلاتی رہتی کہ وہ اس دنیا میں اکیلا نہیں ہے۔

(۲۲)

جب سے وادی میں دہشت گردی شروع ہوئی تب سے یہی منظر دیکھنے کو ملتے تھے۔ کسی جگہ بھیڑ میں سے دو تین ملی ٹنٹ نمودار ہو جاتے اور پاس ہی سیکورٹی فورسز کے بنکر پر ہتھ

گولے پھینکتے یا پھر گولی باری کرتے اور جب تک پولیس جوابی کارروائی کرتی وہ بھیڑ میں گھس کر چھومنتر ہو جاتے۔ غرض یہ کہ وہ معصوم لوگوں کو اپنی ڈھال بنالیتے اور اگر حفاظتی دستے ردِ عمل میں گولیاں چلاتے تو وہ صاف بچ کر نکلتے اور ان کی جگہ عام شہری مرجاتے۔

دہشت گردوں کی دو قسمیں تھیں۔ ایک وہ جو مقامی تھے اور سرحد پار سے مختصر المدتی تربیت پا کر واپس چلے آتے اور وادی میں دہشت پھیلاتے۔ ان کے لیے بندوق اٹھانا ایک ایڈوینچر تھا۔ دوسرے وہ جو غیر ملکی بھاڑے کے ٹٹو تھے اور دولت کی لالچ میں کشمیر میں نام نہاد جہاد کرنے چلے آتے۔ ان میں زیادہ تر پاکستانی، افغانی اور چند افریقی ممالک کے باشندے تھے۔ شہر سے باہر ان ملی ٹنٹوں کا لائحہ عمل کچھ مختلف ہوتا۔ شاہراؤں پر وہ زمین دوز بارودی سرنگیں نصب کرتے جن کے اوپر سے اگر کوئی فوجی گاڑی گزرتی تو دھماکہ ہوجاتا جس کے سبب گاڑی میں سفر کررہے جوان یا تو مارے جاتے یا پھر زخمی ہوتے۔ اس صورت حال سے بچنے کے لیے سیکورٹی فورسز قافلے کی نقل و حرکت سے قبل ان سڑکوں پر بارودی سرنگوں کی کھوج لگاتے اور انھیں صاف کرنے کی کوشش کرتے۔ کہیں بھول سے یا کسی اور وجہ سے کوئی سرنگ رہ جاتی تو فوج کو جان و مال کا بھاری نقصان اٹھانا پڑتا۔

سرحدی گاؤں میں ملی ٹنٹ کھلے عام گھومتے رہتے اور جس گھر میں چاہتے رات بسر کرتے۔ عام طور پر ان کے مستقل ٹھکانے قریبی گھنے جنگلوں میں ہوتے جہاں وہ نہ صرف اپنے رہنے کا انتظام زیرِ زمین خندقوں میں کرتے بلکہ اپنے اسلحہ اور بارود کا ذخیرہ بھی الگ سے چھپالیتے تاکہ سیکورٹی فورسز کو اس کا پتہ نہ چلے۔ اس کے باوجود حفاظتی دستے دیر سویر مخبروں کی مدد سے ان کی نقل و حرکت پر نظر رکھنے میں کامیاب ہوجاتے اور عین وقت پر انھیں گھیر لیتے جس کے بعد گولیوں اور ہتھ گولوں کا تبادلہ ہوتا۔ گولی باری ایک دو روز چلتی جب تک سبھی چھپے ہوئے ملی ٹنٹ مارے نہ جاتے۔ کبھی کبھار چند ایک ملی ٹنٹ بھاگنے میں کامیاب ہوجاتے۔ ایسی وارداتیں تو آئے دن سننے میں آتی تھیں۔ البتہ گولی بارود کے تبادلے کے بعد جب معاملہ ٹھنڈا پڑ جاتا تو

متعلقہ عسکری جماعت گاؤں میں جا کر کچھ لوگوں کو، جن پر ان کا شک گزرتا، مخبری کی پاداش میں موت کے گھاٹ اتارتی۔ ان گاؤں میں کچھ افراد جذبات کے سبب اور اکثر لوگ خوف و دہشت کے باعث خاموش تماشائی بنے رہتے، رات میں کوئی ملی ٹنٹ پناہ لینے کے لیے آجاتا تو اس سے منع نہیں کرتے اور دل ہی دل میں دعا کرتے کہ جلدی سے سحر ہو جائے اور وہ ان کے گھر سے چلا جائے۔ کبھی کبھار مقامی لڑکیوں کی بے حرمتی کے قصے بھی سننے میں آتے تھے مگر کوئی کچھ نہیں بولتا تھا۔ بندوق اور بارود نے سب کے لب سلے تھے۔

بہت عرصہ بعد ایک اور طریقہ سامنے آیا۔ وہ تھا خود کش بمبار کا۔ چند ملی ٹنٹ بموں سے لیس جیکٹ پہن کر تباہی کے مشن پر نکل پڑتے اور سیکورٹی فورسز کے ٹھکانوں پر حملہ کرتے۔ یہ طریقہ بہت ہی ہیبت ناک تھا۔ جو کوئی ایسی مہم پر نکل جاتا، اس کو تبلیغ کے ذریعے ذہنی طور پر اتنا جنونی بنایا جاتا کہ وہ اپنی موت سے بے پرواہ ہو کر اپنا مقصد پانے کی کوشش کرتا۔ جوش میں آکر وہ کسی بھی حد تک خونریزی کرنے کے لیے تیار ہو جاتا۔ ایسی وارداتیں کثرت سے تو نہیں ہوتی تھیں مگر جب بھی ہوتیں ان کا انجام بھیانک ہوتا۔

اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ کشمیر میں دہشت گردی کا بیج بونے اور اس کو پھیلانے میں پاکستانی فوجی حکمرانوں کا بالراست ہاتھ رہا ہے کیونکہ وہ کسی بھی طریقے سے ہندوستان کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے خواہاں رہے ہیں۔ گذشتہ صدی کے اواخر میں روس اور افغانستان کے درمیان جنگ کی وجہ سے پاکستان کے وارے نیارے ہو گئے۔ ایک طرف روسی کمیونسٹوں کے خلاف بنیاد پرست طالبان کھڑے کیے گئے اور دوسری طرف امریکہ سے نہ صرف بے شمار اسلحہ مانگا گیا بلکہ بے پایاں مالی امداد بھی حاصل کی گئی۔ اس امداد کو خرد برد کر کے پاکستانی فوجی حکمرانوں نے کشمیر میں در اندازی کے لیے استعمال کیا۔ غرض یہ کہ ہندوستان کے خلاف پاکستان کی طرف سے نیابتی جنگ شروع ہوئی۔ چونکہ جموں و کشمیر کا کافی سارا حصہ پاکستان کے قبضے میں ہے اس لیے اس کارروائی کو پاکستانی مقبوضہ کشمیر میں مرتکز کیا گیا تا کہ پاکستان

پر بالراست کوئی انگلی نہ اٹھا سکے۔ حالانکہ اس کی نگرانی پاکستانی فوج اور آئی ایس آئی پاکستان کی سرزمین سے کرتی رہی۔

(۲۳)

وادی کے حالات کے پیش نظر مہک ملِک کے والدین مطمئن تھے کہ وہ دہلی میں رہتی ہے اور اس نے کشمیر آنے کا فیصلہ فی الحال ملتوی کر دیا ہے۔ اب تو ماشا اللہ ڈاکٹر مہک ملِک جانی مانی اسپیشلسٹ بن چکی تھی۔ اس کی ناموری کافی بڑھ چکی تھی۔ دہلی میں سردیاں شروع ہو گئی تھیں اور مہک کو اپنے والدین کی آمد کا انتظار تھا۔ ان کے آنے سے اسے کافی تسلی ہو جاتی تھی۔

موسم سرما کی تیاری میں منیر ملک اور شیریں کچھ گرم کپڑے خریدنے کی غرض سے لال چوک پہنچ گئے۔ ان کا ارادہ تھا کہ کچھ دنوں کے بعد وہ اپنی بیٹی کے پاس دہلی چلے جائیں گے۔ منیر ملِک نے اپنی کار فوجی بنکر سے تھوڑی دوری پر ایک سائیڈ میں لگا دی اور دونوں میاں بیوی شاپنگ کرنے کے لیے کار سے نکل کر سامنے والی گلی میں گھس گئے۔ قریباً آدھے گھنٹے کے بعد وہ اپنے ہاتھوں میں چار بھاری بھرکم شاپنگ بیگ لے کر لوٹ آئے۔ کار کے پاس کھڑے ہو کر منیر ملِک نے اپنے دو شاپنگ بیگ شیریں کو تھما دیے اور خود جیب سے کار کی چابی نکالنے لگا۔ دفعتہً نہ جانے کہاں سے ایک دستی بم پھینکا گیا جو نزدیکی فوجی بنکر کے پاس گر گیا۔ اس کے فوراً بعد دوسرا دستی بم سیدھے منیر ملِک کے پاؤں کے پاس پھٹ گیا۔ آناً فاناً منیر ملِک اور شیریں سر سے پاؤں تک لہولہان ہو گئے اور دونوں غش کھا کر زمین پر گر پڑے۔ ان کے پورے جسم گرینیڈ بلاسٹ سے شدید زخمی ہو چکے تھے اور وہ دونوں زمین پر مچھلی کی طرح تڑپ رہے تھے۔ بدن سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ سڑک پر چل رہے مسافروں میں کھلبلی مچ گئی۔ کوئی اِدھر دوڑ رہا تھا اور کوئی اُدھر۔ تھوڑے وقفے کے بعد پولیس اور سرکاری اسپتال کی ایمبولنس پہنچ گئی اور منیر ملِک،

شیریں اور دوسرے زخمیوں کو اسپتال لے گئی۔ حالانکہ ایمبولنس کے ساتھ جو پیرا میڈیکل اسٹاف تھا انھوں نے سبھی زخمیوں کو فوری طور امداد پہنچائی مگر اسپتال جانے سے پہلے ہی دونوں اپنی زندگی کی لڑائی ہار چکے تھے۔

کچھ وقفے کے بعد اسپتال کی ایک ڈاکٹر نے، جو اسکول میں مہک ملِک کی ہم جماعت ہوا کرتی تھی اور جس کے ساتھ اس کا باہمی رابطہ ابھی بھی قائم تھا، اس کو ٹیلی فون پر خبر دی۔ خبر سنتے ہی ڈاکٹر مہک ملِک کے اوسان خطا ہو گئے اور وہ نہ صرف رونے لگی بلکہ اپنے بال بھی نوچنے لگی۔ اس کے رفیق کاروں نے اسے سنبھالنے کی بہت کوشش کی مگر اس کی حالت ایسی تھی کہ سنبھلتے نہیں سنبھل رہی تھی۔ اسپتال میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی اور وہاں کے انتظامیہ نے ڈاکٹر مہک ملِک کو سرینگر بھیجنے کا انتظام کرا دیا تا کہ وہ دوسرے روز اپنے گھر پہنچ سکے۔ رات بھر وہ سو نہ سکی۔ اس نے پہلی فرصت میں گوتم سے ٹیلی فون پر بات کی۔

گوتم نے جونہی ریسیور کان سے لگایا دوسری طرف سے رونے بلکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ مہک کچھ بول ہی نہیں پا رہی تھی۔ گوتم بھی کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ ماجرا کیا ہے۔ وہ گونگے کی طرح کان سے ریسیور لگائے انتظار کرتا رہا۔ کچھ دیر کے بعد ہمت کر کے مہک لڑکھڑاتی آواز میں بول پڑی۔ ''گوتم، ڈیڈی... ممی....! ہینڈ گرینیڈ بلاسٹ.....! ایس ایم ایچ ایس ہاسپٹل ...! میں کل صبح سرینگر آ رہی ہوں۔'' یہ کہہ کر مہک نے ٹیلی فون منقطع کر دیا۔

گوتم یہ سن کر جیسے آسمان سے گر پڑا۔ اس کے ذہن کے پردے پر منیر ملک اور شیریں ملک کی صورتیں نمودار ہو گئیں۔ ان کی محبتیں اور شفقتیں یاد آ گئیں۔ وہ فوراً ایس ایم ایچ ایس ہاسپٹل کے لیے نکل پڑا اور اس کے بعد پولیس سے رابطہ کر لیا۔ اس نے پولیس کو جانکاری دی کہ مرحومین منیر ملک اور شیریں ملک کی ایک ہی بیٹی ہے اور وہ دہلی میں ہے۔ اس کو اطلاع دی گئی ہے اور وہ کل صبح سرینگر پہنچنے والی ہے۔ گھر واپس آ کر اس نے ساری روداد مہک ملِک کو ٹیلی فون پر سنا دی۔

دوسری صبح وہ سیدھا ائیر پورٹ مہک ملک کو ریسیو کرنے کے لیے چلا گیا۔

اس کو دیکھتے ہی مہک ملک کے منہ سے چیخ نکل پڑی۔ ''گوتم، میں لُٹ گئی، برباد ہوگئی۔ پاپا اور ممی مجھ کو چھوڑ کر چلے گئے۔''

گوتم سپرو نے وقت کی نزاکت کو سمجھ کر کسی جذباتی ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا۔ صرف اتنا کہہ دیا۔ ''ڈاکٹر مہک جی، اللہ کی جو مرضی ہوتی ہے وہ ہو کر رہتی ہے۔ اپنے آپ کو سنبھال لیجیے اور صبر سے کام لیجیے۔''

چونکہ سبھی مقامی اخباروں میں منیر ملک اور شیریں ملک کے بم دھماکے میں شہید ہونے کی خبر شائع ہوئی تھی اس لیے گوتم سپرو کے علاوہ وہاں اور بھی کچھ لوگ آئے ہوئے تھے۔ ائیر پورٹ سے ڈاکٹر مہک ملک گوتم سپرو اور ایک قریبی سہیلی کے شوہر کو لے کر سیدھے اسپتال کے مردہ خانے سے لاشیں لینے کے لیے چلے گئے۔ لاشوں کا پوسٹ مارٹم ہو چکا تھا۔ وہاں کسی نے ڈاکٹر مہک کو صلاح دی۔ ''میڈم، بہتر یہ ہوگا کہ آپ ان کا چہرہ دیکھنے کی کوشش نہ کریں۔ آپ برداشت نہیں کر پائیں گی۔''

ڈاکٹر مہک ملک اس کو ٹکر ٹکر دیکھنے لگی مگر خاموش رہی۔

دریں اثنا گوتم سپرو گویا ہوا۔ ''سر، مہک جی خود ایک ڈاکٹر ہے۔ اس کے لیے مسخ شدہ چہرے دیکھنا کوئی نئی بات نہیں۔ کم سے کم آخری سفر سے پہلے اپنے والدین کی صورت تو دیکھ لے گی۔ کچھ تسلی ہو جائے گی۔ ورنہ عمر بھر اپنے آپ کو معاف نہیں کر پائے گی۔''

''مسخ شدہ چہرے....!

مسخ شدہ تہذیب.....!

مسخ شدہ انسانیت....!

ڈاکٹر مہک ملک کے ذہن میں کوندا سا لپکا۔

لاشوں کو گھر لا کر وہاں پر ان کی تجہیز و تکفین کا بندوبست کیا گیا۔ کچھ رشتے دار، سہیلیاں

اور پڑوسی موجود تھے۔ خالد کے خاندان کا کوئی بھی آدمی نہیں آیا تھا۔ کچھ وقفے کے بعد جنازوں کو قبرستان لے جایا گیا۔ گوتم بھی قبرستان تک چلا گیا اور ان کی قبر پر مٹی ڈال کر آ گیا۔ جنازوں کو گھر سے رخصت کرتے وقت مہک ملِک زار و قطار رونے لگی۔ اس کا بس چلتا وہ ان لاشوں کو کبھی بھی اپنے سے جدا نہ ہونے دیتی۔

ڈاکٹر مہک ملِک کے ذہن میں خیالات کا طوفان اُٹھتا رہا۔ وہ سوچنے لگی کہ کیا فائدہ اس کے ڈاکٹر بننے کا....اپنے ہی والدین کو نہیں بچا پائی۔ وہ اپنی صلاحیت اور قابلیت سے بے زار ہوگئی کیونکہ اسے احساس ہوا کہ تعمیر تخریب کے سامنے اکثر بے بس ہو جاتی ہے۔

اس رات جب سبھی لوگ چلے گئے تو ڈاکٹر مہک ملِک کو اپنا گھر سونا سونا سا لگ رہا تھا۔ جس گھر میں خوشیاں ہی خوشیاں نظر آتی تھیں وہاں آج ماتم تھا اور ہر ذرہ نوحہ خواں تھا۔ لاکھ کوششوں کے باوجود نینداس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس نے کئی بار گوتم سپرو سے ٹیلی فون پر بات کی اور وہ ہر بار مہک کو تسلیاں دیتا رہا۔ اس کے بغیر وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ وہ اسے سمجھاتا رہا کہ زندگی میں ایسے کئی مقام آتے ہیں جب خدا انسان کا امتحان لیتا ہے۔ گوتم سپرو اسے چُپ کرانے کی کوشش کرتا رہا اور خود کو سنبھالنے کے لیے تاکید کرتا رہا مگر کامیاب نہیں ہو پایا۔

جمعہ کے روز رشتے داروں اور پڑوسیوں نے فاتحہ پڑھنے کے لیے قبروں کے پاس حاضری دی اور دعائیں کرتے رہے کہ میاں بیوی دونوں کو جنت میں درجات بلند ہوں۔ دھیرے دھیرے لوگوں کا گھر میں آنا جانا بہت کم ہو گیا یا یوں کہیے کہ یکسر بند ہو گیا۔ مہک ملِک کو پہلی بار احساس ہوا کہ وہ کتنی اکیلی ہے۔ قریبی رشتے دار تو تھے نہیں، صرف ایک بوا تھی مگر وہ خار کھائے بیٹھی تھی۔ مہک کو خبر ملی کہ جمیلہ بوا کا بیٹا کئی مہینوں سے غائب ہے اور شاید سرحد پار کر چکا ہے۔ یہاں پولیس اس کی ڈھونڈ ڈھانڈ میں لگی ہوئی ہے۔ کبھی کبھار مہک کے ذہن میں یوں ہی ترنگ سی اٹھتی کہ والدین پر ہتھ گولا پھینکنے میں کہیں اس کا ہاتھ تو نہیں تھا مگر جلدی ہی وہ اپنے سر کو جھٹکتی اور اس خیال کو مسترد کرتی۔

خالد کے بارے میں انفارمیشن مہک ملِک کو کالج ٹائم کی ایک سہیلی شگفتہ نے دی تھی۔

''شگفتہ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ سب کچھ ہونے والا ہے۔ میرے ڈیڈی کی یہ دِلّی تمنا تھی کہ میں ڈاکٹر بن جاؤں۔ میں نے ان کی یہ آرزو پوری کرنے کے لیے رات دن محنت کی مگر کیا معلوم تھا کہ ڈاکٹری گاؤن میں دیکھے بغیر ہی وہ مجھے چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ میرا تو جی چاہتا ہے کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر امریکا یا یورپ چلی جاؤں۔ پھر سوچتی ہوں وہاں جا کر بھی کیا کروں گی، وہاں بھی چاروں طرف دیواریں کاٹنے کو دوڑیں گی۔ سمجھ نہیں آتا کہ کیا کروں؟''

''نہیں بہن، تم اس وقت خود کو سنبھالو۔ جلد بازی میں کوئی فیصلہ نہیں لینا چاہیے۔ کچھ دیر وہیں رہو جہاں تم کام کرتی ہو۔ اس کے بعد اطمینان سے اپنے بارے میں فیصلہ کرلو کہ کیا اچھا رہے گا اور کیا نہیں۔ میرا تو یہی مشورہ ہے۔''

یہی باتیں گوتم سپرو سے بھی ہوئیں۔ وہ بھی ایک روز دوپہر کے وقت آ گیا جب گھر میں اور کوئی نہ تھا۔ مہک نے اس کو بھی اپنے اضطراب سے آگاہ کیا اور کہا کہ وہ چاہتی ہے کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر امریکا یا یورپ چلی جائے۔ گوتم سپرو سے اس کی حالت چھپی ہوئی نہ تھی۔ وہ تو ہر بار اس کو تسلی دیتا تھا۔ اس کو بھروسہ تھا کہ ایک وہی شخص ہے جس کی وہ قدر کرتی ہے اور جس کی بات وہ سمجھ لیتی ہے۔ وہ گویا ہوا۔ ''مہک، ہم ہندوؤں میں اس کو شمشان بیراگ کہتے ہیں۔ جس دکھ درد کو تم جھیل رہی ہو اس میں تو انسان جنگلوں کی راہ لے سکتا ہے، ملازمت ترک کرنا تو معمولی سی بات ہے۔ گوتم بُدھ نے تو عام لوگوں کی پیڑا دیکھ کر محلوں کا عیش و آرام ترک کر دیا تھا اور سنیاس دھارن کیا تھا۔''

''گوتم، کیا ایسا ممکن ہے کہ یہ حادثہ اتفاق نہ ہو بلکہ دہشت گردوں نے میرے والدین کو ہی نشانہ بنایا ہو؟'' ڈاکٹر مہک ملِک کی زبان پر آخر وہ بات آ ہی گئی جس کی وجہ سے وہ مضطرب تھی۔

''تم ایسا کیوں سوچنے لگی ہو؟''

''دراصل ماضی میں کچھ ایسے واقعات پیش آئے ہیں جن کی وجہ سے میرے دماغ میں عجیب سے خدشات پیدا ہو رہے ہیں۔''

''ایسی باتوں کی طرف دھیان ہی مت دو۔ دیکھو مہک جب تک ہماری سانسیں چلتی رہیں گی ہمیں جینا پڑے گا۔ تمھارے والدین کا سانحہ ایک اکیلا واقعہ نہیں ہے، یہاں روزانہ کوئی نہ کوئی آدمی تخریبی کارروائیوں کی بلی چڑھتا ہے۔ معصوم نہتے انسان کراس فائیرنگ کی زد میں آ کر جاں بحق ہو جاتے ہیں۔ نوجوانوں کو ورغلا کر خودکشی کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ مائیں اپنے نوجوان بیٹوں کی یاد میں خون کے آنسو بہاتی ہیں۔ بہنیں اپنے بھائیوں کا دیدار کرنے کے لیے ترستی ہیں۔ آج بھی سیکڑوں لحدیں بے کتبہ ہیں۔ مگر یہ دہشت گرد تنظیمیں ان معصوموں کو اپنی تخریبی بھٹی کا ایندھن بنانے پر بغلیں بجاتی ہیں۔''

''سوال یہ بھی ہے کہ اب میں کس کے لیے جیوں۔ میں تو اکیلی پڑ گئی۔''

''میں ہر دکھ سکھ میں تمھارے ساتھ ہوں۔ تم ایسا مت سمجھو کہ تم اکیلی ہو۔ میری یہ صلاح ہے کہ تم واپس جا کر اپنا کام سنبھالو۔ اگر کسی چیز کی ضرورت محسوس ہو تو بے جھجک مجھ سے کہہ دینا، میں اس کو پورا کرنے کی کوشش کروں گا۔ باقی رہا والد سے متعلق دفتری معاملات اور جائیداد کے کاغذات، وہ سب بعد میں دیکھا جائے گا۔ میں ان کے بارے میں دفتری کارروائی شروع کروں گا اور تمھیں تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کرتا رہوں گا۔''

''ٹھیک ہے گوتم، پھر تم کل یا پرسوں کی میری ہوائی ٹکٹ بُک کروالو اور میں واپس دہلی چلی جاؤں گی۔''

دوسرے دن ڈاکٹر مہک ملِک دہلی کے لیے واپس روانہ ہو گئی۔ گوتم سپرو بھی ائیر پورٹ تک اس کے ساتھ چلا گیا۔ وہ راستے میں بار بار اس کو حوصلہ رکھنے کے لیے تلقین کرتا رہا اور اپنے کام پر فوکس کرنے کی التجا کرتا رہا۔ ائیر پورٹ پر ڈاکٹر مہک ملِک نے یوں الوداع کہا جیسے

اس کی دنیالٹ گئی ہواور وہ خالی ہاتھ لوٹ رہی ہو۔

(۲۴)

گوتم ہر روز مہک سے ٹیلی فون پر بات کرتا، اسے دلاسہ دیتا اور اس کو ہمت نہ ہارنے کے لیے اصرار کرتا۔ مہک کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ آئندہ کیا کرے۔ وہ اپنے مستقبل کے بارے میں فکر مند تھی مگر اس پر فیصلہ لینے کو التوا میں ڈالتی رہی۔

ایک روز مہک کا فون آیا اور وہ گوتم سے سنجیدگی سے کہنے لگی۔ ''گوتم، مجھے سمجھ نہیں آتا کہ میں کیا کروں۔ اگر تم دہلی آؤ تو ہم دونوں دہلی میں اکٹھے رہ سکتے ہیں یا پھر میں انگلینڈ چلی جاؤں جہاں میں ملازمت کرسکتی ہوں بشرطیکہ تم بھی بعد میں وہیں آجاؤ۔ سرینگر میں ہم دونوں ایک ساتھ نہیں رہ سکتے ہیں، تمھیں تو معلوم ہی ہے کہ وہاں کیسا ماحول ہے۔''

''مہک، میں تمھاری تجویز کی بہت قدر کرتا ہوں۔ یہاں کشمیر میں رہ کر ہم دونوں اکٹھے نہیں رہ سکتے۔ میں بھی نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے تم پر کوئی آفت آئے۔ یوں بھی تم نے بہت کچھ سہہ لیا ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ تم کسی اور سے شادی کرلو تو تمہارا کیا جواب ہوگا وہ مجھے معلوم ہے۔ میرے بھائی بندو جب وادی چھوڑ کر چلے گئے اس وقت میں نے ان کا ساتھ دینا مناسب نہیں سمجھا۔ کیوں؟ اس کا جواب شاید میرے پاس نہیں ہے۔ اب اتنے سال یہاں رہ کر نقل مکانی کرنا میرے بس کی بات نہیں۔''

''تو پھر میں کیا کروں؟''

''میں چاہتا ہوں کہ تم کشمیر آکر پریکٹس شروع کرلو اور خدمت خلق میں مصروف ہو جاؤ۔ موجودہ حالات میں یہاں تمھاری بہت ضرورت ہے۔ خدمت سے عظمت ہے۔ کچھ پیشے ایسے ہوتے ہیں جن کا نام لے کر ہی خدمت کا خیال آتا ہے جیسے ڈاکٹر، نرس، استاد وغیرہ۔ بدقسمتی

سے عبقری انخلا کے باعث غیر ترقی یافتہ ممالک سے جتنے بھی ذہین تعلیم یافتہ ڈاکٹر نکلتے ہیں وہ سب دولت کی لالچ میں ترقی یافتہ ممالک کا رخ کرتے ہیں۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ ان کے ملک کا بھی ان پر کچھ حق بنتا ہے۔ پیسہ ہی زندگی میں سب کچھ نہیں ہوتا ہے مہک، خدمت کا صلہ تو اوپر والا دیتا ہے۔ باقی تمھاری مرضی!"

"مگر ہم وہاں اکٹھے نہیں رہ سکتے۔ کیا ہم دونوں کو اپنی زندگی یوں ہی ایک دوسرے کے بغیر ضائع کرنی پڑے گی؟"

"مہک، دو ہی صورتیں ہیں، یا تو کسی اور کو اپنا ہم سفر چن لو اور اپنی ازدواجی زندگی آرام سے بسر کرلو یا پھر زندگی بھر اکیلے رہو اور خدمت خلق کو اپنا نصب العین بنالو۔ فیصلہ تم کو کرنا پڑے گا۔"

"گوتم تمھیں معلوم ہے کہ میں تمھارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اگر میں تمھاری نہیں ہوسکتی تو کسی اور کی بھی نہیں ہوسکتی۔ اتنا تو طے ہے۔ ہاں تم کہیں آس پاس ہوگے تو دل کو تسلی ملتی رہے گی۔ پھر میں سرینگر ہی آجاؤں گی۔"

"یو آر ویلکم، میری آنکھیں تمھاری راہ دیکھتی رہیں گی۔"

ڈاکٹر مہک ملک نے دہلی کے فلیٹ کو بیچنے کا ارادہ باندھا۔ خوش قسمتی سے فلیٹ اسی کے نام پر رجسٹر ہوا تھا۔ کچھ دلالوں سے بات کرلی اور پھر مہینے بھر میں سودا طے ہوا۔ خریدار نے سارا روپیہ ڈاکٹر مہک ملک کے بنک اکاونٹ میں جمع کر دیا اور پھر کورٹ میں مکان کی رجسٹری ہوئی۔ انجام کار دہلی سے ڈاکٹر مہک ملک کا ناتا پوری طرح سے ٹوٹ گیا اور وہ واپس کشمیر جانے کے لیے تیار ہوگئی۔

کچھ ہی دنوں میں وہ بذریعہ ہوائی جہاز سرینگر پہنچ گئی جہاں گوتم سپرو اس کے استقبال کے لیے ہوائی اڈے پر انتظار کر رہا تھا۔ وہاں سے وہ سیدھے اپنے گھر چلی گئی۔ کچھ دنوں کے بعد اس نے گوتم سپرو سے صلاح مشورہ کیا کہ آگے کیا کرنا چاہیے۔ ڈاکٹر مہک ملک نے اپنی تازہ مالی

حالت سے گوتم سپرو کو آگاہ کرلیا۔ دہلی کا فلیٹ فروخت کرنے سے کافی سرمایہ ملا تھا۔ جس تین منزلہ آبائی مکان میں وہ رہتی تھی وہ حد سے زیادہ بڑا تھا اور اکیلی جان کے لیے غیر محفوظ۔ آٹھ بڑے بڑے کمرے اور بالائی منزل پر ایک وسیع ہال تھا۔ اس کے علاوہ سوپور کے گرد و نواح میں اس کے دو میوہ باغات تھے جن میں سیب کے درخت لگے ہوئے تھے اور ہر سال ان سے کمائی ہوتی تھی۔ دونوں اس بات پر متفق ہو گئے کہ آبائی مکان کو ایک چھوٹے سے اسپتال میں تبدیل کیا جائے اور پہلی منزل پر ایک کمرہ ڈاکٹر کے مشورے کے لیے مختص کیا جائے۔ آوٹ ڈور مریض مشاورتی کمرے میں ڈاکٹر سے مل سکیں گے جبکہ زچگی کی حالت میں ڈیلیوری کے لیے جو مریض آئیں گے ان کے لیے اسپتال کے دوسرے کمروں میں باضابطہ بیڈ کا انتظام کیا جائے گا۔ ایک بڑا کمرہ آپریشن تھیئٹر کے لیے مختص کیا جائے گا جبکہ بالائی منزل پر دفتری انصرام اور اسٹورز سے متعلق بندوبست کیا جائے گا۔

اسپتال شروع کرنے کے لیے قانون کے تحت لائسنس کی ضرورت تھی۔ اس واسطے جو بھی رسمی کارروائی کرنا تھی وہ گوتم سپرو نے دوڑ دھوپ کر کے مکمل کی۔ دہلی کا فلیٹ بیچ کر جو سرمایہ ملا تھا اس کا کچھ حصہ اسپتال کی بنیادی ضروریات جیسے ایمبولنس، فرنیچر، سرجکل اوزار، آلات، ایکس رے اور دیگر مشینیں خریدنے کے لیے صرف کیا گیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر مہک ملِک نے دو ڈاکٹر، نرسنگ اور دیگر اسٹاف کی بھرتی کر لی۔ آپریشن سے پہلے مخدر بلانے پر حاضر ہو جاتا تھا۔ خود ڈاکٹر مہک نے اپنی رہائش کے لیے نزدیک ہی ایک چھوٹا سا گھر کرائے پر لے لیا۔ اسپتال کی ساری سجاوٹ ایک انٹیریئر ڈیکوریٹر سے مشورہ کر کے کی گئی۔ اسی کی نگرانی میں دو مہینوں کے اندر سارا کام مکمل ہوا۔ اسپتال کا نام 'شیریں جنرل اینڈ میٹرنٹی ہاسپٹل' رکھا گیا۔ کچھ ہی مہینوں میں اسپتال کا کام زوروں سے چل نکلا اور ڈاکٹر مہک ملِک کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ جہاں تک گوتم سپرو کا سوال تھا، ابتدائی مرحلے میں وہ اپنے اسکول سے چھٹی لے کر اسپتال کے کام کے ساتھ جڑا رہا مگر بعد میں ڈاکٹر مہک ملِک کی تجویز پر اس نے اسکول سے استعفیٰ دے کر اسپتال میں ایڈمنسٹریٹو

اور اکاونٹنگ کا کام سنبھالا۔

ڈاکٹر مہک ملِک جہاں امیر مریضوں سے باضابطہ فیس اور دیگر اخراجات وصول کرتی تھی وہیں غریب مریضوں سے کوئی فیس نہیں لیتی تھی اور اسپتال میں داخلے کی صورت میں ان سے صرف لازمی اخراجات طلب کرتی۔ دولت مند مریضوں کے لیے اس نے مزید آسائشیں میسر کی تھیں تاکہ وہ آرام اور اطمینان سے اسپتال میں رہ سکیں۔ مریضوں کے اسپتال لانے اور واپس لے جانے کے لیے ایمبولنس کا بھی انتظام کیا گیا۔ اس حوالے سے شیریں ہاسپٹل کا ہر طرف چرچا ہونے لگا۔

گوتم سپرو کو من ہی من بہت خوشی ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر مہک ملِک اس کی شاگرد بھی تھی اور اس سے محبت بھی کرتی تھی۔ اگرچہ دونوں کی زندگی میں کئی سانحات نے گرہن لگایا تھا پھر بھی وہ اعتماد اور دلیری سے زندگی کا مقابلہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کی زندگی میں ایک ایسی دائمی الجھن پیدا ہوئی تھی کہ فرار کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ نہ تو ایک دوسرے کے ساتھ ازدواجی بندھن میں بندھ سکتے تھے اور نہ ہی ایک دوسرے سے دور رہ سکتے تھے۔ تاہم زندگی کی گاڑی کچھ حد تک پٹری پر آ چکی تھی۔ دونوں اپنے اپنے کام میں مصروف رہتے تھے، اکثر ایک دوسرے کی خبر لیتے تھے اور ایک دوسرے کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔

(۲۵)

وقت یوں ہی گزرتا رہا۔ شیریں جنرل اینڈ میٹرنٹی ہاسپٹل دن دوگنی رات چوگنی ترقی کر رہا تھا۔ ڈاکٹر مہک ملِک اور گوتم سپرو دونوں شاداں و فرحاں نظر آ رہے تھے۔ ایک جانب تسلی بخش کمائی ہو رہی تھی اور دوسری جانب غریبوں کی امداد کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی جاتی تھی۔ اسی دوران میں ڈاکٹر مہک ملِک نے اسپتال کی توسیع کا پلان بنا لیا۔ اس معاملے میں اس نے نہ

صرف گوتم سپرو کی رائے لی بلکہ ایک جان پہچان والے آرکیٹیکٹ سے بھی صلاح مشورہ کیا۔ بقول آرکیٹیکٹ ایک اچھا اسپتال بنانے کے لیے کم سے کم پانچ چھ کنال زمین درکار ہوگی جس پر تین منزلہ عمارت بنائی جاسکتی ہے۔ اس کی رائے سن کر ڈاکٹر مہک ملِک سوچ وترڈد میں پڑ گئی۔

ایک روز اچانک غیر متوقع واقعہ پیش آیا۔ ابھی رات کی تاریکی کو مطیع کر کے سورج کی نازک وملائم کرنیں گل ولالہ کو چھونے کی کوشش کر رہی تھیں کہ ڈاکٹر مہک ملِک چائے ناشتہ کر کے اسپتال میں وارد ہوئی۔ وہ اپنے مشاورتی کمرے میں اکیلی بیٹھی کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ کچھ وقفے کے بعد ایک بوڑھے مریض کو اس کے چند پڑوسی اسپتال لے کر آ گئے۔ اس کو سانس لینے میں بہت تکلیف ہو رہی تھی۔ لگتا تھا دل کا دورہ پڑا ہے۔ پڑوسیوں نے بتایا کہ وہ ایک پنجابی کھتری ہے جو تمباکو اور نسوار کی بزنس کرتا ہے اور ساری وادی کو سپلائی کرتا ہے۔ مگر اب وہ اکیلا رہ گیا ہے۔ اس کے سگے سمبندھی سب وادی سے ہجرت کر چکے ہیں لیکن اس نے ہجرت کرنے سے انکار کیا۔ اسپتال کی رجسٹر میں اس کا نام لالہ دین دیال اور عمر پچھتّر سال لکھی گئی۔

ابتدائی طبی امداد دینے کے بعد اور وقت ضائع کرنے کے بغیر ڈاکٹر مہک ملِک کی ہدایت پر اسے اسٹریچر پر آئی سی یو لے جایا گیا جہاں اس کی بیماری کی تشخیص کی گئی۔ وہاں اس کا ای سی جی اور ایکو لیا گیا اور پھر اس کی ہارٹ بیٹ کو مانیٹر پر مسلسل چیک کیا گیا۔ ساتھ ہی اس کے بدن میں گلوکوز کے ساتھ وریدی انجکشن کے توسل سے دوائیاں بھی پہنچائی گئیں۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر مہک ملِک نے شہر کے نامور کارڈیولوجسٹ کو ٹیلی فون پر اسپتال آنے کی درخواست کی تاکہ وہ مریض کو دیکھ سکے۔ اسپیشلسٹ نے چیک اپ کر کے دوائیاں لکھ دیں اور مریض پر نگرانی رکھنے کی ہدایت کر لی۔ ہوش تو کچھ دیر بعد ہی آ گیا مگر صحت بحال ہونے میں دو تین روز لگ گئے۔ بعد میں اس کو آئی سی یو سے رخصت کر کے ایک آرام دہ کمرے میں منتقل کر دیا گیا۔ اس کی تیمار داری میں کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی حالانکہ ڈاکٹر مہک ملِک کو یقین نہیں تھا کہ اخراجات کی ادائیگی کوئی کر سکے گا۔ جو بھی اشخاص اس کے ساتھ اسپتال آئے تھے، ان کے

ساتھ اس کا کوئی خون کا رشتہ نہیں تھا۔ اس کے باوجود ڈاکٹر مہک ملک روزانہ آکر خود ہی اس کی خبر گیری کرتی رہی۔

چوتھے روز جب ڈاکٹر مہک ملِک معائنے کی خاطر اسپتال میں چکر لگا رہی تھی تو لالہ دین دیال نے آداب کہہ کر اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرلی۔ ''ڈاکٹر میڈم، آپ لوگوں نے جس طرح رات دن میری سیوا کی مجھے دھنیہ واد کہنے کے لیے شبد ہی نہیں مل رہے ہیں۔ آپ نے تو اسپیشلسٹ کو بھی تُرت بلایا اور مجھے نئی زندگی بخشی، اس سے بڑھ کر مہربانی اور کیا ہو سکتی ہے۔''

''یہ تو ہمارا فرض ہے، انکل۔''

''کیا میں آپ کو بیٹی کہہ سکتا ہوں؟..... کہیں میں آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کر رہا ہوں۔''

''نہیں انکل، آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ آپ جیسے بزرگ کے مبارک قدم میرے اسپتال میں پڑے اور آپ اللہ کے فضل سے صحتیاب ہوگئے، یہ تو میرے لیے بہت بڑی حصولیابی ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ کی اچھی طرح دیکھ بھال ہوئی ہوگی۔ ایک دو روز میں آپ کا ڈسچارج ہو جائے گا۔ ہاں ایک بات اور۔ جب بیٹی کہا ہے تو مجھے 'آپ، آپ' کہہ کر شرمندہ نہ کریں۔''

''بیٹی، تم تو ڈاکٹر ہو اور بہت مصروف رہتی ہو۔ تمھاری سیوا بھاونا دیکھ کر میں حیران ہوں۔ بھگوان تمھیں عمر دراز عطا کرے۔ میرا کیا ہے۔ زندگی کے پچھتّر سال گزر چکے ہیں۔ آج موئے کل دوسرا دن۔''

''اللہ نہ کرے۔ آپ تو ہمارے لیے رحمت ہیں۔ ابھی تو بہت دن جینا ہے آپ کو۔'' ڈاکٹر مہک ملِک اس کے سامنے اسٹول پر بیٹھ گئی اور اس کے ساتھ بڑی اپنائیت کے ساتھ باتیں کرتی رہی۔

''انکل، چائے یا فروٹ جوس پئیں گے کیا؟ منگوا دوں۔''

''نہیں بیٹی، میں نے تو ابھی چائے اور ناشتہ کر لیا ہے۔ یہاں اسپتال میں کھانا بہت

اچھا ملتا ہے۔ یہاں کا اسٹاف بھی بہت ہی رحم دل، شفقت آمیز اور مہمان نواز ہے۔ انھوں نے میری خوب خدمت کی، خدا آپ کو اور آپ کے اسپتال کے اسٹاف کو اپنی امان میں رکھے۔''

''انکل، آپ کہاں رہتے ہیں؟''

''یہیں پاس ہی.... وزیر باغ میں...! وہاں میرا اپنا گھر ہے۔''

''گھر میں اور کوئی نہیں ہے کیا؟''

''نہیں بیٹی، میری اولادیں ہیں، ان کے بال بچے ہیں۔ پہلی بیوی کے سورگباش ہونے پر دوسری شادی کی تھی مگر وہ بھی بھگوان کو پیاری ہوگئی۔''

''وہ دکھائی نہیں دیے۔''

''وہ.... یہاں کہاں...؟ وادی میں جونہی ملی ٹنسی شروع ہوئی سبھی خوفزدہ ہوکر اپنی جانیں بچانے کے لیے بھاگ گئے۔ مجھے بھی ساتھ لینا چاہتے تھے، بہت اصرار کرتے رہے، مگر میں نے صاف انکار کر دیا۔ وہاں جاکر کرتا بھی کیا؟ پرائی جگہ.... پرایا ماحول.... پرائے لوگ....! یہاں پر میرا کاروبار ہے۔ پچاس سال سے چلا رہا ہوں، تمباکو اور نسوار کا ہول سیل بزنس کرتا ہوں۔ ساری وادی میں سپلائی ہوتا ہے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ آج کل ان ملی ٹنٹ جماعتوں کو گاہے بہ گاہے جبری وصولی دینی پڑتی ہے۔ گھر پر کشتوار کی ایک نوکرانی رکھی ہے جو وہیں رہتی ہے اور گھر کا سارا کام کرتی ہے۔ حیرت بس اس بات کی ہے کہ سبھی بچے مجھے بھول گئے جیسے میں ان کے لیے وجود ہی نہیں رکھتا۔ پہلے تو کبھی کبھار فون پر بات چیت ہو جاتی تھی مگر اب وہ بھی بند ہوگئی۔ شاید سبھی اپنے اپنے کنبوں کی دیکھ بھال میں مصروف ہوگئے۔''

''ہاں انکل، یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ لہلہاتا چمن دیکھتے ہی دیکھتے اجڑ گیا۔ ایسا لگتا ہے کہ آندھی آکر سارے گلستان کو تباہ و برباد کرگئی۔''

''بیٹی، ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ جب مجھے اسپتال میں داخل کرایا گیا، اس وقت یہاں میرا کوئی اپنا نہیں تھا، سنا ہے کہ چند مسلمان پڑوسی مجھے یہاں لے کر آئے تھے۔

دراصل جب مجھے دورہ پڑا تھا میری نوکرانی نے فوراً بغل میں دو پڑوسیوں کو اطلاع دی اور انھوں نے ہی مجھے اپنی کار میں یہاں تک پہنچا دیا۔آپ نے میرا علاج کرلیا، آئی سی یو میں کئی دن رکھا، دوائیاں دیں، کھانا کھلایا، آپ کے ذہن میں کبھی یہ اندیشہ پیدا نہیں ہوا کہ اس کا خرچہ کون ادا کرے گا۔"

"نہیں انکل، ایک بار بھی ایسا خیال ذہن سے نہیں گزرا۔ دینے والا تو اللہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر کے لیے مریض کی جان اہم ہوتی ہے، اس کی جیب نہیں۔ ہم یہاں پر کئی غریب مریضوں کا مفت علاج کرتے ہیں اور اگر انھیں اسپتال میں بھرتی ہونا پڑتا ہے تو ان سے صرف وہی اخراجات وصول کر لیتے ہیں جو دوائیوں وغیرہ پر صرف ہوتی ہیں، نہ کمرے کا کرایہ لیتے ہیں، نہ ڈاکٹروں کی فیس، نہ ٹیسٹ کرنے کی لاگت وصول کرتے ہیں اور نہ خدمتانہ، نفع کی تو خیر بات ہی نہیں۔ بدقسمتی سے اسپتال بہت چھوٹا ہے اس لیے ہم بڑے پیمانے پر مریضوں کی خدمت نہیں کر پاتے ہیں۔آپ کو سن کر حیرانی ہوگی کہ دنیا میں بے نفس خیراتی عطیات دینے والے فلاح کاروں کی کوئی کمی نہیں ہے۔کئی بار نیک پارسا دین دار متمول لوگ اسپتال کے لیے زکوٰۃ بطور فریضہ دے جایا کرتے ہیں اور یہ بھی ہدایت دیتے ہیں کہ ان کی پہچان مخفی رہنی چاہیے۔"

"بیٹی تمھارے پتا جی بھی ڈاکٹر تھے کیا؟ یہ اسپتال انھوں نے بنوایا ہے کیا؟ کتنے برس ہو گئے اس کو بنے ہوئے؟"

"نہیں انکل، اپنے خاندان میں میں پہلی ڈاکٹر ہوں۔ میرے والد صاحب سرکاری افسر تھے اور والدہ گھریلو عورت۔ممی ڈیڈی کو مجھے ڈاکٹر بنانے کی بڑی آرزو تھی۔مگر اُس سے پہلے ہی وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ دونوں لال چوک کے پاس بم بلاسٹ میں شہید ہو گئے جب کہ انھوں نے اپنی زندگی میں کبھی کسی کا برا نہیں چاہا تھا۔ میں اس وقت دہلی میں ٹریننگ کر رہی تھی۔ یہ اسپتال میں نے اپنے ہی گھر میں اپنی امّی کے نام پر شروع کیا ہے۔"

"دھنیہ ہیں ایسے مہان ماں باپ۔انھیں سورگ نصیب ہو۔میری یہی دعا ہے۔"

''میں انھیں صبح وشام یاد کرتی ہوں۔اور بھی تو کوئی سہارا نہیں ہے۔''

''بہت اچھا کرتی ہو بیٹی۔تمھاری بات سچ ہے کہ اسپتال بہت چھوٹا ہے مگر بیٹی صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔بھگوان پر بھروسہ رکھو۔''

''ہاں انکل، اسی کا تو آسرا ہے۔ابھی میرے پاس اسپتال کی توسیع کے لیے سرمایہ نہیں ہے۔سوچتی ہوں کہ آگے کہیں اور زمین خرید کر اچھا سا اسپتال بنواؤں گی۔''

''بہت اچھا منصوبہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ایک دن یہ اسپتال شہر کے گنے چنے اسپتالوں میں سے ایک ہوگا۔بھگوان تمھیں کامیاب بنادے۔میری آشیر باد تمھارے ساتھ ہے۔''

تین روز کے بعد لالہ دین دیال کا ڈسچارج ہوا۔اس کے مسلسل اصرار پر ڈاکٹر مہک ملِک نے اس کو اخراجات کی بل تھمادی جو اس نے گھر پہنچتے ہی چیک کے ذریعے ادا کی اور چیک اس ملازم کو سونپ دی جو ڈاکٹر مہک کی ہدایت کے مطابق اس کو گھر پر چھوڑنے کے لیے مامور کیا گیا تھا۔

(۲۶)

تقریباً تین مہینے گزر گئے۔لالہ دین دیال کی صحت قدرے بحال ہو چکی تھی۔ڈاکٹر مہک ملِک نے اس کو ہدایت دی تھی کہ وہ ہر ماہ اپنا چیک اپ کرانے اسپتال آیا کرے خاص کر اس روز جب کارڈیولوجسٹ دستیاب ہو۔لالہ دین دیال مشاورتی کمرے میں داخل ہوا اور ڈاکٹر مہک ملِک کو نمستے کہہ دیا۔اتفاق سے وہاں گوتم سپرو بھی بیٹھا تھا۔اس روز کسی ہنگامی مصروفیت کی وجہ سے کارڈیولوجسٹ نہیں آیا تھا۔ڈاکٹر مہک نے دین دیال کا ملاحظہ کیا۔اس کی نبض اور ہارٹ بیٹ چیک کر لی۔پھر گویا ہوئی۔''آپ کی صحت پہلے سے قدرے بہتر لگ رہی ہے۔غذا وغیرہ کے بارے میں پرہیز جاری رکھیں اور روزانہ دو تین میل مارننگ واک کیا کریں۔''

''سو تو میں کرتا ہوں۔ڈاکٹر صاحب نے جو ہدایات دی تھیں، ان پر پورا عمل کرتا

ہوں۔البتہ آج مجھے کچھ ذاتی بات کرنی ہے۔اجازت ہے کیا؟''

''ضرور کیجیے۔ یہ میرے قریبی دوست اور رہنما ہیں، گوتم سپرو۔اس اسپتال کو بنانے میں ان کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے۔''

گوتم سپرو نے سر جھکا کر لالہ دین دیال کو نمستے کہا۔

لالہ دین دیال کو سکون سا محسوس ہوا۔ پھر وہ ڈاکٹر مہک ملِک سے مخاطب ہوا۔''بیٹی، میں ایک تجویز لے کر آیا ہوں۔اگر تم ٹھیک سمجھو تو اس پر غور کر لو۔''

''انکل، آپ بولیے تو سہی، مجھ سے جتنا ہو سکے گا کر لوں گی۔''

''نہیں بیٹی، تمھیں کچھ بھی نہیں کرنا ہے۔بس ہاں کہہ دینا ہے۔''

''آپ بتا تو دیجیے۔آپ تو میرے بزرگ ہیں، آپ کی تجویز تو میرے ہی فائدے کے لیے ہوگی۔''

''بات دراصل یوں ہے کہ میری دوسری بیوی دس سال پہلے سورگباش ہو گئی۔اس کے دو بچے ہیں۔ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔ بیٹا ایم بی اے کر کے مجھے میرے بزنس میں مدد کرتا رہا۔اس کی فیملی میرے ساتھ ہی رہتی تھی۔بیٹی کا شوہر چائے کا تھوک بیوپاری تھا جس کی دکان مہاراج گنج میں تھی۔ حالات بگڑتے ہی دونوں نے بنکوں میں پڑی اپنی ساری پونجی ٹرانسفر کروائی اور وادی چھوڑ کر چلے گئے۔ بیٹا پہلے ممبئی چلا گیا اور پھر وہیں سے دبئی کی راہ لی۔ داماد نے اندور میں ریڈی میڈ کپڑوں کی دکان کھول لی۔ بیٹی وہیں پر اسکول میں پڑھاتی ہے۔میری پہلی بیوی کو مرے ہوئے تیس سال ہو گئے۔اس کا ایک بیٹا تھا جس کو میں نے پڑھایا لکھایا اور انجینئر بنایا، اس کے بعد وہ امریکا چلا گیا۔وہیں شادی بھی کر لی۔ابتدا میں کچھ سال آتا رہا مگر اس کی سوتیلی ماں کے ساتھ نہیں بن پائی اس لیے اس نے ہندوستان آنا ہی چھوڑ دیا۔اب تو نہ جانے کتنے برس ہو گئے اس کو دیکھے ہوئے۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ اب وہ کہاں ہے۔ہے بھی یا نہیں، بھگوان ہی جانتا ہے۔میں نے ایک بیوہ عورت کو، جو کشتوار سے تعلق رکھتی ہے، کئی

برس پہلے بطور نوکرانی رکھ دیا، وہ میرے گھر میں رہتی ہے اور میری دیکھ بھال کرتی ہے۔ زندگی کی گاڑی یوں ہی چل رہی ہے۔''

وہ کچھ دیر کے لیے خاموش رہا، پھر دوبارہ گویا ہوا۔ ''بیٹی، تمھیں یاد ہوگا کہ تم سے ایک بار اتفاقاً اسپتال کے بارے میں گفتگو ہوئی تھی اور تم نے خواہش ظاہر کی تھی کہ تم ایک اچھا سا اسپتال بنانے کا ارادہ رکھتی ہو۔ میری دعا ہے کہ تم اس مقصد میں جلد از جلد کامیاب ہو جاؤ۔ میرے پاس نئے ائیر پورٹ کے نزدیک پیر باغ میں پانچ کنال زمین کا ایک ٹکڑا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ زمین آپ کو اسپتال بنانے کے لیے تحفے کے طور پر ٹرانسفر کرلوں۔ میرا تو اب یہاں کوئی وارث نہیں ہے، جو ہیں ان سب کے پاس زندگی بسر کرنے کے لیے کافی دولت ہے۔ اس لیے خیال آیا کہ کیوں نہ کسی فلاحی کام کے لیے اس زمین کو خیرات دوں۔ اس روز میں تم سے گفتگو کر کے اور تمھارے خیالات جان کر کافی متاثر ہوا اور اس کے بعد یہی سوچتا رہا کہ کیسے میں تمھارے اس نیک کام میں مدد کر سکوں۔ اس مادی دنیا میں جہاں لوگ ہر چیز میں منافع ڈھونڈتے ہیں، تمھاری غریب پروری دیکھ کر مجھے تعجب ہوا۔ میری نوکرانی بھی ایک بار تمھارے پاس آئی تھی، تم نے اس سے ایک پیسہ بھی نہیں لیا تھا، الٹے کئی دوائیاں مفت میں دی تھیں۔ وہ تو تمھاری تعریف کرتے کبھی تھکتی نہیں۔ میں نے لوگوں سے بھی سنا ہے کہ تم غریبوں کا علاج مفت کرتی ہو۔ اس لیے میں نے بہت سوچ بچار کر کے طے کرلیا کہ کیوں نہ میں اپنی بیٹی کے اس نیک کام میں تھوڑی بہت مدد کرلوں۔''

خدا مہربان تو جگ مہربان۔ ڈاکٹر مہک ملِک اور گوتم سپرو دونوں ہکّا بکّا ہو کر رہ گئے۔ ڈاکٹر مہک نے سنا تھا کہ خدا دیتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔ مگر اس نے یہ نہیں سنا تھا کہ وہ اس طرح دیتا ہے۔ نہ جان نہ پہچان، ایک اجنبی اپنی زندگی کی جمع پونجی اس کے حوالے کرنے کا خواہش مند ہے۔ پہلے تو اس کو اپنے کانوں پر یقین ہی نہیں آیا۔ سوچنے لگی کہ لالہ دین دیال سچ کہہ رہا ہے یا مذاق کر رہا ہے۔ پھر اس نے بڑی انکساری سے کہا۔ ''انکل، میں تو سمجھتی ہوں کہ اس

زمین پر قانونی ورثا کا حق ہے، پہلے ان سے مشورہ تو کر لیجیے۔''

''نہیں بیٹی جیسا میں نے پہلے بھی بتایا کہ میرا اب یہاں کوئی وارث نہیں بچا ہے۔ جتنے بھی ورثا ہیں، سبھوں کے پاس زندگی گزارنے کے لیے ضرورت سے زیادہ دولت ہے۔ اس لیے میری زندگی کی کچھ کمائی اگر اچھے کاموں میں صرف ہو جائے تو میں اپنی خوش نصیبی سمجھوں گا۔ یہ زمین میں نے خود اپنی محنت کی کمائی سے خریدی ہے، اس لیے میں اس کو بیچنے یا تحفے میں دینے کا مجاز ہوں۔''

''انکل، آپ جیسا چاہیں گے ویسا ہی ہوگا۔ آپ بے فکر رہیں۔'' گوتم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ پھر گویا ہوئی۔ ''گوتم جی میرے صلاح کار ہیں۔ ان معاملوں میں میری مدد کرتے ہیں، میں اس بارے میں ان سے تفصیل سے بات کرلوں گی اور آپ کو اپنا فیصلہ کل یا پرسوں تک ٹیلی فون پر بتادوں گی۔ پھر آگے جو بھی کارروائی کرنی ہوگی، وہ کی جائے گی۔''

گوتم سپرو بھی یہ تجویز سن کر حیران ہوا تھا۔ وہ خاموشی سے لالہ دین دیال اور ڈاکٹر مہک ملک کی گفتگو سن رہا تھا۔ اس نے لالہ دین دیال کو مخاطب ہو کر کہا۔ ''لالہ جی، یہ تو آپ زندگی کا سب سے بڑا اپنیہ کاریہ کر رہے ہیں۔ میں تو آپ کی باتیں سن کر ہی آپ کا مرید ہو گیا۔ بھگوان آپ کو لمبی عمر اور صحت عطا کرے۔''

لالہ دین دیال اجازت لے کر اپنے گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔ ڈاکٹر مہک ملک بہت دیر تک سوچتی رہی کہ کہیں یہ بوڑھا سٹھیا تو نہیں گیا ہے، وہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟ کافی فکر و تردّد کے بعد اسے محسوس ہوا کہ زندگی میں ایسے بھی مقام آتے ہیں کہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی آدمی کو کچھ اپنا نہیں لگتا۔ ہر طرف خلا ہی خلا نظر آتا ہے۔ پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے تو سوچتا ہے کہ وہ سب لوگ جنھیں میں نے پالا پوسا، جن سے میں نے محبت کی اور جن کے لیے میں نے اپنی زندگی وقف کی، آج کہاں ہیں؟ کیا وہ سب ایک سراب تھا؟

رخصت ہوتے وقت گوتم سپرو اور ڈاکٹر مہک ملک کی آنکھیں بڑی دیر تک لالہ دین

دیال کا تعاقب کرتی رہیں۔اس کے جانے کے بعد دونوں اس موضوع پر گفتگو کرتے رہے۔ دونوں کو ایسے لگ رہا تھا جیسے انھیں قارون کا خزانہ مل گیا ہو۔فیصلہ یہ ہوا کہ زمین کے کاغذات کی جانچ پڑتال کرائی جائے اور اگر اس میں کوئی تضاد نہیں پایا گیا تو باضابطہ طور پر عدالت میں بیع نامہ کرایا جائے اور لالہ دین دیال کی شرطیں اس میں درج کردی جائیں۔یہ بھی فیصلہ ہوا کہ ایک ٹرسٹ بنایا جائے جس کے نام پر زمین ٹرانسفر کی جائے گی اور اس کے ٹرسٹی ڈاکٹر مہک ملِک، گوتم سپرو اور مہک کی سہیلی شگفتہ ہوگی۔ٹرسٹ کا نام گوتم نے 'منیر ملِک فلاحی ٹرسٹ' تجویز کیا جو ڈاکٹر مہک ملِک کو بہت پسند آیا۔اس بارے میں وکیل سے بھی بات ہوئی اور اس نے اپنی منظوری دے دی۔ٹرسٹ بنانے کے لیے وکیل نے ساری کارروائی مکمل کردی۔

متعلقہ پٹواری سے زمین کے کاغذات اور اس کی ملکیت کی جانچ پڑتال کرائی گئی۔ تصدیق نامہ ملکیت ملنے کے بعد گوتم سپرو نے وکیل سے رابطہ کرکے عدالت میں زمین کی رجسٹریشن کرانے کی کارروائی شروع کی۔زمین 'منیر ملِک فلاحی ٹرسٹ' کے نام رجسٹر ہوئی اور کاغذات پر لالہ دین دیال اور ٹرسٹ کی مجاز دستخط کنندہ ڈاکٹر مہک ملِک نے دستخط کیے۔دین دیال نے کوئی بھی شرط نہیں رکھی۔

دوسرے روز ڈاکٹر مہک ملِک اور گوتم سپرو دین دیال کے گھر پہنچ گئے۔ڈاکٹر مہک ملِک نے دین دیال سے اجازت لے کر اس کی دیکھ بھال کا ذمہ اپنے اوپر لے لیا اور اس کی نوکرانی کو گھر صاف رکھنے، دین دیال کے کپڑوں کی صفائی کرنے اور اس کے کھانے پینے کے بارے میں ضروری ہدایات دیں جس کے لیے اس نے نوکرانی کو اپنی جیب سے خرچہ دینے کی یقین دہانی کرلی۔اس دن کے بعد ڈاکٹر مہک اور گوتم سپرو کا وہاں اکثر آنا جانا لگا رہا۔ڈاکٹر مہک جب بھی آتی، کچن اور لالہ دین دیال کے ذاتی وارڈروب کا معائنہ ضرور کرتی اور کچھ کمی بیشی نظر آتی تو واپس جاکر وہ سبھی چیزیں بھجوادیتی۔نوکرانی کی ضروریات کی طرف بھی وہ خاصا دھیان دیتی۔

لالہ دین دیال کو ایسا محسوس ہوتا جیسے اس کو اپنی بیٹی مل گئی ہے۔

(۲۷)

اِدھر ایک روز ایک خاتون شیریں ہسپتال میں چلی آئی اور ڈاکٹر صاحبہ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ خاتون نے اپنا نام ساحرہ بتایا۔ وہ جمیلہ کی بہو اور خالد بٹ کی بیوی تھی۔ اسے دیکھ کر ڈاکٹر مہک حیراں ہوگئی۔ کچھ خوشی بھی ہوئی اور کچھ اندیشہ بھی ہوا۔ ساحرہ نے البتہ تذبذب کے بادل ہٹا کر بتایا کہ وہ اپنا معائنہ کرانے کے لیے آئی ہے۔ وہ مزید کہنے لگی ''میں نے کئی برس پہلے خالد بٹ سے شادی کر لی مگر ہمارا بچہ پیدا نہیں ہوتا۔ کئی ڈاکٹروں سے مشورہ کیا۔ پیروں فقیروں کی چوکھٹ پر حاضری دی مگر بے ثمر۔ آج تک میری گود خالی ہے۔ اس پر مصیبت یہ کہ میری ساس اپنے بیٹے کو اٹھتے بیٹھتے اکساتی ہے کہ تمھاری بیوی بانجھ ہے تم دوسری شادی کرلو۔ اس طرح میرا مستقبل غیر یقینی ہوگیا ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ میں نے آپ کے بارے میں بہت کچھ سنا ہے۔ آپ میرا آخری آسرا ہیں۔ آپ کچھ مدد کر سکیں تو کر لیجیے۔ میں آپ کی عمر بھر قرضدار رہوں گی۔''

ڈاکٹر مہک ملِک نے ساحرہ کو بھروسہ دلایا۔ ''تم فکر مت کرو، میں تمھاری جانچ کرلوں گی اور اگر کچھ پیچیدگی ہوگی تو اس کا ازالہ کرنے کی کوشش کروں گی۔''

باتوں باتوں میں ساحرہ نے بتایا۔ ''تین ساڑھے تین سال سے میرا شوہر خالد بٹ روپوش ہے۔ پولیس آٹھوں پہر اس کی تلاش کرتی پھرتی ہے۔ میرا سسر دماغی توازن کھو بیٹھا ہے جبکہ ساس اور بیٹے میں نہ جانے کیا ساز باز ہو رہی ہے۔ کبھی میرے خلاف اور کبھی آپ کے خلاف۔ اُس گھر میں آپ کا نام لینا بھی ان کو گوارا نہیں ہوتا۔ کسی کے منہ سے آپ کے بارے میں کچھ بھی سننا نہیں چاہتے ہیں۔ انھیں تو آپ کے وجود سے ہی نفرت ہے۔ مگر میں نے آپ کی پاکیزگی اور غریب پروری کے بارے میں بہت کچھ سنا ہے، یہ بھی سنا ہے کہ آپ کے نعمت یافتہ

ہاتھوں میں خداداد شفا ہے، اس لیے کب سے آپ کی صورت دیکھنے کو ترس رہی تھی۔ آج کل میں اپنے میکے میں رہتی ہوں اور وہیں سے چوری چھپے یہاں آئی ہوں۔

خالد وہاں مہینے میں ایک دو بار بھیس بدل کر آ جاتا ہے۔ وہاں پر اتنا کڑا پہرہ نہیں ہے جتنا کہ اس کے آبائی گھر کے باہر، اس لیے آنے جانے میں اس کو کوئی مشکل نہیں ہوتی۔ میری جانکاری کے مطابق وہ پہلے تو کسی انتہا پسند سیاسی پارٹی کے ساتھ منسلک تھا، پھر سرحد پار عسکری ٹریننگ کر کے واپس چلا آیا اور کئی بم دھماکوں اور گولی باری کی واردات میں ملوث ہو گیا۔ جب سے سیکورٹی فورسز اس کا پیچھا کر رہے ہیں۔ اس نے اپنا نام خالد بٹ کے بجائے ابوسلمان رکھا ہے۔ کبھی کبھی ٹی وی پر ابوسلمان کی تصویر بطور ملی ٹنٹ دکھائی جاتی ہے جس کی پولیس کو تلاش ہے۔ شاید اس کو دیکھ کر آپ پہچان بھی نہ پائیں گے، اس نے تو لمبی ڈاڑھی رکھ لی ہے اور لباس بھی پوری طرح بدل ڈالا ہے۔ میں نے تو بہت کوشش کی کہ وہ یہ سب چھوڑ چھاڑ کر راہِ راست پر آ جائے اور حسب معمول زندگی بسر کرے خاص کر جب اس کے والدین اور شریکِ حیات ابھی زندہ ہیں۔ مگر عسکری جماعتوں کی تبلیغ نے اس کو اپنے شکنجے میں جکڑ لیا ہے۔ اس پر آزادی کا بھوت سوار ہو چکا ہے اور لاکھ کہنے پر بھی وہ باز نہیں آتا۔

ڈاکٹر مہک ملِک ساحرہ کو او۔ ٹی میں لے کر چلی گئی اور اس کا باریک بینی سے معائنہ کر لیا۔ اندام نہانی کی صفائی کی اور پھر ہدایت کی کہ اگلے بیس پچیس دن تک تمھیں لگاتار ہر تیسرے دن آنا پڑے گا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ ساحرہ ڈاکٹر کے حکم کے مطابق ہر تیسرے دن حاضری دیتی رہی۔ خوش قسمتی سے انہی دنوں ڈاکٹر مہک ملِک کے پاس ترسیل تخم کی عمل انگیزی کے لیے جاپان سے دھات کے کچھ باریک حلقے بطور سیمپل آ گئے جن کو اس نے پہلی بار تجربے کے لیے ساحرہ کے اندام نہانی میں استعمال کیا نیز اس کو احتیاط برتنے کی صلاح بھی دی۔ قریب مہینے بھر کے بعد ساحرہ کی ابکائیاں آنے لگی اور وہ ڈاکٹر مہک ملِک کے پاس دوڑتی چلی آئی۔

ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے اس کو مذاقاً کریدا۔ ”کیوں ساحرہ، لگتا ہے خالد اب

تمھارے پاس ہی رہنے لگا ہے، مہم پر نہیں جاتا ہے کیا؟''

''آپ کو کیسے معلوم...؟'' ساحرہ کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ دوبارہ گویا ہوئی۔

''ہاں، حال ہی میں اس نے دس روز تک میرے میکے میں ہی قیام کیا۔ نہ کہیں آنا نہ کہیں جانا۔ مجھے تو ڈر لگ رہا تھا کہ پولیس کہیں تلاشی نہ لے، ہم سب قید کر لیے جاتے۔ سب سے زیادہ فکر تو مجھے اپنے والدین کی ہے کیونکہ وہ سن رسیدہ ہیں۔ ہم میں سے کوئی اس کو نہ کچھ کہہ سکتا ہے نہ تنبیہ کر سکتا ہے۔ اس کا پستول دیکھ کر ہی سب خاموش ہو جاتے ہیں۔''

''اوہو، تو تم لوگ گھر میں بیٹھ کر تخریب کے بدلے تعمیر میں مشغول رہے۔ اجاڑنے کے بدلے ایک نئی دنیا آباد کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ کمال ہے...! خود اپنی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں کہ آج ہے کل رہے گی یا نہیں، پھر ایک نئی معصوم جان کو وجود میں لا کر خطرے میں ڈالنے کا کیا مطلب؟ کل کو کوئی انہونی بات ہو جائے تو اس کی پرورش کون کرے گا؟ پیدا کرنا ہی انسان کا کام نہیں ہوتا، آخر بچے کی صحیح پرورش بھی تو ضروری ہوتی ہے۔''

''آپا، میں نے کئی بار اس کو یہی بات سمجھانے کی کوشش کی۔ لیکن اس کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ جواب میں وہ کہتا ہے کہ اللہ رازق ہے، اپنے مخلوق کو وہ خود ہی رزق پہنچاتا ہے۔''

''ساحرہ! تم ماں بننے والی ہو۔ اس حالت میں احتیاط برتنا بہت ضروری ہے۔ زیادہ محنت کرنا، کوئی بھاری بھرکم چیز اٹھانا اور غم و فکر کرنا تمھاری صحت کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔''

ساحرہ یہ سن کر خوشی سے پھولی نہ سمائی۔ میکے پہنچتے ہی اس نے اپنے والدین کو خوشخبری سنائی۔ ساس کو بھی کسی رشتے دار کے توسط سے خبر پہنچا دی۔ جمیلہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھاگی چلی آئی۔ اتفاقاً دوسرے روز خالد بٹ بھی رات کے وقت چپکے سے آیا۔ اس کو جب یہ مژدہ سنایا گیا تو اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔

''تمھیں کیسے معلوم ہوا؟'' جمیلہ نے استفسار کیا۔

''میں گذشتہ ماہ سے ڈاکٹر مہک ملِک کے زیرِ علاج ہوں۔ یہ اسی کا کرشمہ ہے۔ جب اس کو میں نے اپنی ابکائیوں کے بارے میں بتایا تو اس نے غور سے معائنہ کر کے یہ خوشخبری دی۔ ساتھ میں یہ بھی کہا کہ معاملہ نازک ہے اس لیے احتیاط برتنا ضروری ہے۔''

''اوہ تو تم ان دنوں ڈاکٹر مہک ملِک کے پاس جاتی رہی ہو۔ کیوں اس دنیا میں اس کے سوا اور کوئی ڈاکٹر نہیں ملا؟'' جمیلہ بٹ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''جی دنیا تو ڈاکٹروں سے بھری پڑی ہے مگر اللہ تعالیٰ کسی کسی کو ہی دستِ شفا عطا کرتا ہے۔ مجھے پہلے بھی کئی ڈاکٹروں نے معائنہ کیا تھا مگر سب ناکام رہے۔ یہاں تک کہ آپ نے مجھے بانجھ کا لیبل بھی لگایا تھا۔ میری مامی نے مجھے ڈاکٹر مہک ملِک سے مشورہ لینے کو کہا۔ اس کی تو سارے شہر میں دھوم ہے۔ وہ تو مریضوں کے لیے مسیحا کا درجہ رکھتی ہے۔''

''ہاں اب تو مسیحا بن گئی ہے۔ ماں باپ کو کھا گئی۔ میرا بھائی بے چارہ جوانمرگ ہو گیا۔ سارا گھر تباہ کر دیا۔ نہ شادی نہ بچے۔ لنڈوری فاختہ...!'' جمیلہ بٹ نے اپنی بھڑاس نکالی۔

''وہ اپنے ماں باپ کو نہیں کھا گئی بلکہ کچھ شر پسندوں نے اس کے معصوم والدین کو شہید کر دیا۔ جو لوگ نہ تخلیق کرنے کے قابل ہوتے ہیں اور نہ تعمیر، وہ تخریب کے سوا اور کر ہی کیا سکتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحبہ کے والدین نے کسی کا کیا بگاڑا تھا کہ انھیں ہدف بنایا گیا۔ کیا معلوم وہ حادثہ تھا، اتفاق تھا یا پھر انھیں عمداً نشانہ بنایا گیا۔'' ساحرہ نے اپنے شوہر کو کن انکھیوں سے دیکھ کر بے دھڑک جواب دیا۔

''امّی، ظاہر ہے کہ ساحرہ کے لیے وہ مسیحا سے کم نہیں ہے، چاہے آپ کے لیے ہو یا نہ ہو۔ آپ نے تو اپنا فیصلہ سنایا تھا کہ ساحرہ بانجھ ہے اور مجھے دوسری شادی کرنے کی صلاح بھی دی تھی۔ ڈاکٹر مہک ملِک نے اس کو دوسری زندگی بخش دی، جینے کا مقصد دیا۔ پھر وہ اس کی تعریف نہیں کرے گی تو اور کیا کرے گی۔'' خالد نے ماں کو چپ کرانے کے لیے وضاحت سے کام لیا۔

جمیلہ بیٹے کے الفاظ سن کر برہم ہو گئی اور وہاں سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی

جہاں اس کے لیے بستر بچھایا گیا تھا۔ کچھ دیر کے بعد وہ خوابوں کی دنیا میں کھوگئی۔
خالد بٹ اور ساحرہ بھی سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

(۲۸)

زمین کی رجسٹریشن اور انتقالِ اراضی کرا کے ڈاکٹر مہک ملِک کے لیے جو دوسرا مرحلہ درپیش تھا وہ اسپتال کی عمارت کا نقشہ بنوانا تھا۔ ڈاکٹر مہک ملِک کی سابقہ ہم جماعت کا والد دہلی کا نامور آرکیٹیکٹ تھا۔ دونوں کے اچھے باہمی تعلقات تھے اور ہم جماعت اس کے حالات سے پوری طرح واقف تھی۔ ڈاکٹر مہک ملِک نے اس کے ساتھ رابطہ قائم کیا اور اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ ہم جماعت نے فوراً اپنے والد سے بات کی اور اس نے نقشہ بنانے کی کوئی زیادہ قیمت نہیں مانگی۔ نقشہ بنانے کے لیے وہ سرینگر آیا، زمین کا معائنہ کیا، کچھ ٹیسٹ کروائے اور پھر ڈاکٹر مہک ملِک اور گوتم سپرو سے اس بارے میں تفصیل سے گفتگو کی۔ اس کے بعد وہ دہلی واپس چلا گیا اور وہاں سے نقشے تیار کر کے بھیج دیے۔

سرمائے کی عدم دستیابی کے سبب آرکیٹیکٹ نے تین مرحلوں میں اسپتال بنانے کی تجویز رکھی۔ طے یہ ہوا کہ عمارت 'U' کی شکل میں کل تین منزلوں پر مشتمل ہوگی۔ پہلے عمارت کے مرکزی بلاک کی تعمیر کا منصوبہ بنایا گیا جس میں رجسٹریشن، ایڈمنسٹریشن، او پی ڈی، ایمرجنسی، چند اہم وارڈس اور اسپیشلسٹ ڈاکٹروں کے کمرے مختص کیے گئے۔ اس وِنگ میں صرف زچگی، قلب، گردوں، اور ہڈیوں کے امراض کے لیے انتظام کیا گیا۔ تین چار سال کے بعد دائیں اور بائیں بازو کے بلاکوں کی تعمیر کا منصوبہ بنایا گیا جب تک مزید سرمایے کا انتظام ہو جاتا۔ غرض یہ کہ فوری طور اسپتال کے مرکزہ کی بنیاد ڈالی جاتی اور سنٹرل وِنگ کی تعمیر مکمل ہونے پر وہاں اسپتال کا کام شروع کیا جاتا۔ اگلے تین چار سالوں میں منافع کمانے کے قوی امکانات تھے جس سے

سرمائے کی قلت کم ہوجاتی۔ علاوہ ازیں کچھ بنکوں سے رابطہ کرنا مقصود تھا تاکہ ان سے قرضہ لیا جاسکے۔ ڈاکٹر مہک ملِک اور گوتم سپرو کو یہ طریق عمل پسند آیا اور دونوں وقت ضائع کرنے کے بغیر اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے میں جُٹ گئے۔

مختلف سرکاری محکمہ جات سے جتنے بھی ضروری اجازت نامے درکار تھے، وہ جستہ جستہ حاصل کیے گئے۔ خوش قسمتی سے مرکزی وِنگ کے لیے بنک سے قرضے کا بھی بندوبست ہوا حالانکہ کافی حد تک سرمایہ جستہ جستہ ڈاکٹر مہک ملِک نے سوپور کے باغات فروخت کرکے جُٹایا۔ نتیجتاً پراجیکٹ بہت تیزی سے تکمیل کی جانب بڑھنے لگا۔ ڈاکٹر مہک ملِک اپنے موجودہ اسپتال میں مصروف رہتی تھی مگر گوتم سپرو نئے پراجیکٹ کی نگرانی میں دن رات ایک کرنے لگا۔

پھر ایک اور معجزہ ہوا۔ لالہ دین دیال ایک بار پھر ڈاکٹر مہک ملِک کے آفس میں حاضر ہوا اور اس کو پندرہ لاکھ کی چیک پیش کی۔ ''بیٹی، اسپتال کی تعمیر کے لیے میری طرف سے یہ چھوٹا سا تحفہ قبول کرلو۔''

چندروز پہلے لالہ دین دیال کی معیادی بیمہ پالیسی واجب الادا ہوگئی تھی اور اس کو اٹھارہ لاکھ تین سو روپے کی چیک مل گئی تھی جو اس نے اپنے بنک اکاونٹ میں جمع کردی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اب اس عمر میں یہ رقم اس کے کس کام آسکتی ہے۔ بال بچے تو سب چلے گئے تھے اور وہ اکیلا رہ گیا تھا۔ اس نے تو اپنی زندگی جی لی تھی پھر اس رقم کی اس کو کیا ضرورت تھی؟ دفعتاً اس کے ذہن میں ایک خیال سا کوندا اور اس کو ڈاکٹر مہک ملِک کی یاد آ گئی۔ لالہ دین دیال کو احساس گناہ نے اپنی گرفت میں لے لیا اور وہ سوچنے لگا کہ عمر بھر میں لوگوں کو نسوار، تمبا کو اور سگریٹ پلا کر ان کی صحت برباد کرتا رہا۔ نہ جانے کتنوں کو تپ دق اور دیگر امراض نے جکڑ کر زندگی سے محروم کردیا ہو۔ ان کے روح سے بددعائیں نکلی ہوں گی جس کا میں خمیازہ اٹھا رہا ہوں۔ کیوں نہ میں اس آخری پڑاؤ پر کچھ نیک کام کرلوں۔ اس نے اسی وقت فیصلہ کرلیا کہ یہ رقم ڈاکٹر مہک ملِک کے حوالے کردے گا تاکہ کسی اچھے کام میں صرف ہو۔

جہاں اس کے لیے بستر بچھایا گیا تھا۔ کچھ دیر کے بعد وہ خوابوں کی دنیا میں کھوگئی۔ خالد بٹ اور ساحرہ بھی سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

(۲۸)

زمین کی رجسٹریشن اور انتقالِ اراضی کرا کے ڈاکٹر مہک ملِک کے لیے جو دوسرا مرحلہ درپیش تھا وہ اسپتال کی عمارت کا نقشہ بنوانا تھا۔ ڈاکٹر مہک ملِک کی سابقہ ہم جماعت کا والد دہلی کا نامور آرکیٹیکٹ تھا۔ دونوں کے اچھے باہمی تعلقات تھے اور ہم جماعت اس کے حالات سے پوری طرح واقف تھی۔ ڈاکٹر مہک ملِک نے اس کے ساتھ رابطہ قائم کیا اور اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ ہم جماعت نے فوراً اپنے والد سے بات کی اور اس نے نقشہ بنانے کی کوئی زیادہ قیمت نہیں مانگی۔ نقشہ بنانے کے لیے وہ سرینگر آیا، زمین کا معائنہ کیا، کچھ ٹیسٹ کروائے اور پھر ڈاکٹر مہک ملِک اور گوتم سپرو سے اس بارے میں تفصیل سے گفتگو کی۔ اس کے بعد وہ دہلی واپس چلا گیا اور وہاں سے نقشے تیار کر کے بھیج دیے۔

سرمائے کی عدم دستیابی کے سبب آرکیٹیکٹ نے تین مرحلوں میں اسپتال بنانے کی تجویز رکھی۔ طے یہ ہوا کہ عمارت 'U' کی شکل میں کل تین منزلوں پر مشتمل ہوگی۔ پہلے عمارت کے مرکزی بلاک کی تعمیر کا منصوبہ بنایا گیا جس میں رجسٹریشن، ایڈمنسٹریشن، او پی ڈی، ایمرجنسی، چند اہم وارڈس اور اسپیشلسٹ ڈاکٹروں کے کمرے مختص کیے گئے۔ اس وِنگ میں صرف زچگی، قلب، گردوں، اور ہڈیوں کے امراض کے لیے انتظام کیا گیا۔ تین چار سال کے بعد دائیں اور بائیں بازو کے بلاکوں کی تعمیر کا منصوبہ بنایا گیا جب تک مزید سرمایے کا انتظام ہو جاتا۔ غرض یہ کہ فوری طور اسپتال کے مرکزہ کی بنیاد ڈالی جاتی اور سنٹرل وِنگ کی تعمیر مکمل ہونے پر وہاں اسپتال کا کام شروع کیا جاتا۔ اگلے تین چار سالوں میں منافع کمانے کے قوی امکانات تھے جس سے

سرمائے کی قلت کم ہو جاتی۔ علاوہ ازیں کچھ بنکوں سے رابطہ کرنا مقصود تھا تا کہ ان سے قرضہ لیا جا سکے۔ ڈاکٹر مہک ملک اور گوتم سپرو کو یہ طریق عمل پسند آیا اور دونوں وقت ضائع کرنے کے بغیر اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے میں جُٹ گئے۔

مختلف سرکاری محکمہ جات سے جتنے بھی ضروری اجازت نامے درکار تھے، وہ جستہ جستہ حاصل کیے گئے۔ خوش قسمتی سے مرکزی وِنگ کے لیے بنک سے قرضے کا بھی بندوبست ہوا حالانکہ کافی حد تک سرمایہ جستہ جستہ ڈاکٹر مہک ملِک نے سوپور کے باغات فروخت کر کے جُٹایا۔ نتیجتاً پراجیکٹ بہت تیزی سے تکمیل کی جانب بڑھنے لگا۔ ڈاکٹر مہک ملِک اپنے موجودہ اسپتال میں مصروف رہتی تھی مگر گوتم سپرو نئے پراجیکٹ کی نگرانی میں دن رات ایک کرنے لگا۔

پھر ایک اور معجزہ ہوا۔ لالہ دین دیال ایک بار پھر ڈاکٹر مہک ملِک کے آفس میں حاضر ہوا اور اس کو پندرہ لاکھ کی چیک پیش کی۔ ''بیٹی، اسپتال کی تعمیر کے لیے میری طرف سے یہ چھوٹا سا تحفہ قبول کر لو۔''

چند روز پہلے لالہ دین دیال کی معیادی بیمہ پالیسی واجب الادا ہو گئی تھی اور اس کو اٹھارہ لاکھ تین سو روپے کی چیک مل گئی تھی جو اس نے اپنے بنک اکاونٹ میں جمع کر دی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اب اس عمر میں یہ رقم اس کے کس کام آ سکتی ہے۔ بال بچے تو سب چلے گئے تھے اور وہ اکیلا رہ گیا تھا۔ اس نے تو اپنی زندگی جی لی تھی پھر اس رقم کی اس کو کیا ضرورت تھی؟ دفعتاً اس کے ذہن میں ایک خیال سا کوندا اور اس کو ڈاکٹر مہک ملِک کی یاد آ گئی۔ لالہ دین دیال کو احساس گناہ نے اپنی گرفت میں لے لیا اور وہ سوچنے لگا کہ عمر بھر میں لوگوں کو نسوار، تمباکو اور سگریٹ پلا کر ان کی صحت برباد کرتا رہا۔ نہ جانے کتنوں کو تپ دق اور دیگر امراض نے جکڑ کر زندگی سے محروم کر دیا ہو۔ ان کے روح سے بددعائیں نکلی ہوں گی جس کا میں خمیازہ اٹھا رہا ہوں۔ کیوں نہ میں اس آخری پڑاؤ پر کچھ نیک کام کر لوں۔ اس نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ یہ رقم ڈاکٹر مہک ملِک کے حوالے کر دے گا تا کہ کسی اچھے کام میں صرف ہو۔

چیک دیکھ کرڈاکٹر مہک ملِک تذبذب میں پڑگئی۔اس نے لالہ دین دیال سے مودبانہ لہجے میں کہا۔''انکل، آپ نے تو پہلے ہی اسپتال کے لیے اتنی قیمتی زمین خیرات دی، اب اس کی کیا ضرورت ہے ۔ میں تو سر سے پاؤں تک آپ کی مقروض ہوں ، آپ مجھے اور شرمندہ نہ کریں۔''

''بیٹی کبھی باپ کی مقروض نہیں ہوتی ۔کیا تم میری بیٹی نہیں ہو؟ کیا میرا یہ حق نہیں بنتا کہ ایک اولوالعزم بیٹی کواس کے خوابوں کی تعبیر پانے کے لیےاس کا سہارا بنوں؟ تم یوں سمجھ لو کہ یہ تحفہ تمھارے پِتا جی کی طرف سے ایک چھوٹی سی بھینٹ ہے۔میری التجا ہے کہ اسے سویکار کرلو۔''

ڈاکٹر مہک ملِک لاجواب ہوگئی۔اس نے لالہ دین دیال کی محبتوں کے سامنے سرخم کیا اور چیک قبول کرلی۔اسے انسانی رشتوں پر حیرت ہورہی تھی کہ کیسے اجنبی لوگ خونی رشتوں سے بھی زیادہ محبتیں برساتے ہیں جبکہ خونی رشتے ایک دوسرے کی بیخ کنی پر دن رات لگے رہتے ہیں۔اس کو اپنے والد کی بات یاد آ گئی کہ دنیا میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جو آپس میں پیار بانٹنا چاہتے ہیں، ایک دوسرے کے سکھ دکھ میں شریک ہونا چاہتے ہیں اور ایک دوسرے کے آنسو پونچھنا چاہتے ہیں۔ بدقسمتی سے ایسے لوگوں کی ہمدردی اور غریب نوازی ٹینکوں اور بم دھماکوں کے شور وغل میں دب کر رہ جاتی ہے۔

وہ سوچنے لگی کہ کاش دنیا میں ایسے ہی سرمایہ دار پیدا ہوتے جو اپنے سرمایہ کو اپنی اور بچوں کی عیاشیوں کے بدلے غریبوں اور ضرورت مندوں کی بہبود کے لیے صرف کریں۔اس نے کہیں پڑھا تھا کہ گاندھی جی کی ایسی ہی سوچ تھی کہ سرمایہ قوم کی امانت ہوتا ہے اور سرمایہ دار محض اس کے امین یعنی ٹرسٹی ہوتے ہیں۔انھیں اپنی بنیادی ضروریات کو پورا کرنے کے بعد اس سرمایہ کو فلاح عامہ کے لیے صرف کرنا چاہیے۔ڈاکٹر مہک جب کبھی لالہ دین دیال کو دیکھتی تھی تو اسے اپنے والد منیر ملِک کی بہت یاد آتی تھی۔اسے خیال آتا کہ کاش وہ آج زندہ ہوتے اور دیکھتے کہ ایک مخلص انسان کے خوابوں کی تعبیر کے لیے کیسے بےلوث اجنبی آگے آکر انسانیت کا

فرض نبھا رہے ہیں۔

لالہ دین دیال کے رخصت ہونے کے بعد ڈاکٹر مہک نے گوتم سپرو کو بلوایا اور اس کے ہاتھ میں چیک دے کر کہا۔ ''گوتم، یہ لو ایک اور نذرانہ دین دیال انکل کی طرف سے موصول ہوا ہے۔ میں نے تو پہلے لینے سے انکار کیا مگر انھوں نے زبردستی پکڑا دیا اور کہا کہ ایک پِتا جی کی طرف سے یہ چھوٹی سی بھینٹ سویکار کرلو۔ میں جواب میں کچھ بھی نہ کہہ سکی۔''

اُدھر آرکیٹیکٹ نے ایک قابل مقامی کنٹریکٹر کا انتخاب کرلیا اور اپنی طرف سے ایک جونیئر انجینئر کو نگرانی کے لیے رکھ دیا۔ اس کے بعد کھدائی کا کام شروع ہوگیا اور 'شیریں سپر اسپیشلٹی ہاسپٹل' کی بنیاد پڑ گئی۔ مرکزی بلاک تقریباً ڈیڑھ سال میں پوری طرح تیار ہوا۔ اسپتال کیلئے ساز وسامان، آلات، ایمبولنس اور مشینیں بھی خریدی گئیں۔ مرکزی بلاک کی تعمیر مکمل ہوتے ہی کئی نوجوان ڈاکٹروں کو ملازم رکھا گیا اور ساتھ ہی پیرامیڈیکل و دیگر اسٹاف کی بھرتی کی گئی۔ کچھ اسپیشلسٹ ڈاکٹروں نے بھی اسپتال جوائن کرلیا جبکہ کچھ بطور وزیٹنگ ڈاکٹرس معینہ وقت کے لیے اسپتال میں حاضری دینے لگے۔ اس طرح ہسپتال کا کام چل نکلا۔ پرانے اسپتال کا سارا عملہ اور ساز وسامان نئی جگہ شفٹ کرلیا گیا اور اس کو رہائش کے طور پر دوبارہ استعمال کیا جانے لگا۔

ڈاکٹر مہک ملِک دُبدھا میں پڑ گئی کہ اسپتال کی مرکزی وِنگ کا افتتاح کس سے کروایا جائے۔ دو آپشن تھے، ریاستی گورنر یا پھر لالہ دین دیال۔ بہت غور و فکر کرنے کے بعد گوتم سپرو اور ڈاکٹر مہک دونوں اس نتیجے پر پہنچے کہ مرکزی بلاک کا نام 'لالہ دین دیال بلاک' رکھا جائے اور گورنر کو بطور مہمان خصوصی مدعو کیا جائے تا کہ سرکار کی جانب سے امداد ملنے کے دروازے کھل جائیں۔ گورنر نے افتتاحی پروگرام میں اسپتال کے لیے دس لاکھ کی نقد رقم اور کئی امدادی سکیموں کا اعلان کردیا۔ پروگرام میں لالہ دین دیال کو بطور اعزازی مہمان مدعو کیا گیا۔ ڈاکٹر مہک ملِک نے ان کا تعارف کراتے ہوئے ان کے احسانات کا تفصیل سے ذکر کیا: ''لالہ دین دیال صاحب نے مجھے

اپنی بیٹی کا رتبہ دیا ہے اور میری زندگی میں والد کی کمی پوری کردی ہے۔انھوں نے پانچ کنال زمین جوان کی ذاتی ملکیت تھی ،منیر ملِک فلاحی ٹرسٹ کو بطور تحفہ دی ۔ اسی زمین پر آج یہ عالیشان اسپتال کھڑا ہے۔علاوہ ازیں لالہ جی نے اسپتال کی تعمیر کے لیے پندرہ لاکھ روپے بھینٹ کیے ہیں۔ان عنایتوں کے لیے میں ان کی مرہونِ منت ہوں۔''

(۲۹)

گرمیوں کے موسم میں آرکیٹیکٹ اپنی فیملی کو لے کر سیر سپاٹے کے لیے کشمیر آیا۔اس نے ڈاکٹر مہک ملِک کے گھر پر بطور مہمان قیام کیا۔دن میں کنبے کے ساتھ پہلگام ،گلمرگ ، سون مرگ، اہرہ بل وغیرہ کی سیر کرنے چلے جاتا اور رات میں ڈاکٹر مہک کے ساتھ ڈنر کرتا۔اسپتال کے پروجیکٹ کا اس نے موقع پر ہی جائزہ لیا اور باقی دو بلاکوں کے بارے میں بھی ڈاکٹر مہک ملِک کے ساتھ صلاح مشورہ کیا۔لالہ دین دیال اور سرکار کی طرف سے مالی امداد ملنے سے پروجیکٹ کی رفتار میں خاصی تیزی آئی تھی۔اسپتال کے مرکزی بلاک کے مدِ نظر بنک بھی قرضہ دینے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔تاہم ڈاکٹر مہک ملِک نے اطمینان کے لیے آرکیٹیکٹ سے پراجیکٹ کے تخمینے کے بارے میں پوچھ لیا تاکہ یہ فیصلہ کر سکے کہ دونوں بلاک ایک ساتھ شروع کریں یا صرف ایک بلاک کی تعمیر کی جائے۔چنانچہ لاگت کا اندازہ ہو کر ڈاکٹر مہک ملِک اور گوتم سپرو نے فیصلہ کر لیا کہ مزید دو بلاکوں کی تعمیر ایک ساتھ ہی شروع کردی جائے۔انھوں نے آرکیٹیکٹ کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا اور جلدی ہی کام شروع ہوا۔ڈاکٹر مہک ملِک نے رہائشی مکان کو چھوڑ کر اپنی ساری جائیداد خصوصاً میوہ باغات فروخت کیے۔اسپتال کے دو بلاکس کے لیے دو بنکوں سے الگ الگ قرضہ لیا گیا۔بہر حال اس بار پراجیکٹ کی تکمیل میں تقریباً دو سال لگ گئے۔

اسپتال کی پوری عمارت تعمیر ہونے کے بعد ڈاکٹر مہک ملِک اس کو بار بار دیکھنے لگی اور خوشی سے پھولی نہ سمائی۔دونوں بلاکوں کے الگ الگ نام رکھے گئے ، دائیں بلاک کو منیر ملِک

بلاک' کا نام دیا گیا اور بائیں طرف کے بلاک کو نعیم قریشی بلاک کا نام دیا گیا۔ پروفیسر نعیم قریشی میڈیکل کالج میں ڈاکٹر مہک کے چہیتے استاد تھے۔ ڈاکٹر مہک ملِک کی تمنّا تھی کہ ایک بلاک کو گوتم سپرو کے والد کے نام سے منسوب کیا جائے مگر حالات کے مدِ نظر گوتم نے منع کر دیا۔ وہ کسی غیر ضروری شک وشبہ کا بیج بونے کے حق میں نہیں تھا۔

تیار ہونے پر دونوں بلاکوں کا ایک ساتھ افتتاح کیا گیا۔ مہمان خصوصی کے طور پر ریاست کے وزیر اعلیٰ کو دعوت دی گئی جبکہ لالہ دین دیال کو ایک بار پھر بطور اعزازی مہمان کے مدعو کیا گیا۔ تقریب بہت شاندار رہی۔ وزیر اعلیٰ نے افتتاحی لیکچر میں اسپتال کے لیے سرکاری امداد کا اعلان کر دیا۔ نیز انھوں نے ڈاکٹر مہک ملِک کی ہمت، حوصلے، صبر اور ثابت قدمی کی خوب تعریف کی اور نوجوانوں کو ڈاکٹر مہک ملِک سے کچھ درس لینے کی تلقین کی۔ اظہار تشکر میں ایک نوجوان ڈاکٹر نے مہمان خصوصی کا شکریہ ادا کر کے اس بار بھی لالہ دین دیال کی خوبیوں اور اسپتال کو دی گئی ان کی مالی امداد پر روشنی ڈالی اور ان کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا۔

کچھ ہی دنوں میں اسپتال مکمل طور پر کام کرنے لگا۔ تجربہ کار ڈاکٹروں اور نرسوں کے عملے کا بھی انتخاب کیا گیا۔ ڈاکٹر مہک ملِک کا زیادہ تر وقت اب ہسپتال کے انصرام میں صرف ہوتا تھا۔ تاہم وہ سیریس کیسز کی طرف خود ہی توجہ دیتی تھی۔ جب تک اسپتال رہائشی مکان میں چلتا تھا، گوتم حساب کتاب خود ہی رکھ لیتا تھا مگر اسپتال کے مکمل ہو جانے کے بعد سب کچھ تبدیل ہو گیا۔ اکاونٹس کے لیے پیشہ ور اکاونٹنٹ کا انتخاب کرنا پڑا اور گوتم سپرو اب صرف اسپتال کے انتظام سے جڑ گیا۔

(۳۰)

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کشمیر میں حالات واضح طور پر بدل رہے تھے۔ حالانکہ کشمیری پنڈت وادی سے ہجرت کر کے کب کے جا چکے تھے، تاہم اس فرقے سے تعلق رکھنے والے مٹھی بھر لوگ چند جگہوں پر قیام کر رہے تھے۔ قوموں کی تاریخ میں یہ کوئی عجب بات نہیں

ہے۔ بٹوارے کی خون ریزی کے باوجود آج بھی پاکستان اور بنگلہ دیش میں کئی ہندو رہتے ہیں۔ اس کو یا تو ان کا آلکس کہیے یا پھر نظریۂ جبریت پر یقین۔ کشمیر میں ان گنے چنے ہندوؤں کے ہونے سے عسکری تنظیموں کو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کیونکہ ان کا جو اصلی مدعا تھا وہ تو اس قوم کے اخراج کے ساتھ ہی پورا ہو گیا۔ بچے کھچے لوگ بے ضرر تھے نیز ان کو پروپیگنڈہ کا ذریعہ بنایا جا رہا تھا۔ انتہا پسند جماعتوں کا استدلال تھا کہ اگر یہ لوگ کسی جانی یا مالی نقصان کے بغیر اپنی مرضی سے وادی میں جی رہے ہیں تو پھر باقی ماندہ لوگ کیوں بھاگ گئے؟ بقول ان جماعتوں کے اس سے صاف ظاہر ہے کہ ان لوگوں کو گورنر جگموہن نے سوچی سمجھی چال کے تحت وادی سے نکال دیا تاکہ وہ چین کی طرز پر سرینگر میں تیانن من اسکوائر کا سانحہ دہرا سکے۔ اب ان کو کون سمجھاتا پھرے کہ چین ایک خفیہ نظامی مطلق العنان ملک ہے جہاں کسی قسم کی بغاوت برداشت نہیں کی جاتی ہے۔ اس کے برعکس ہندوستان ایک کثیر الجماعتی جمہوری ملک ہے جہاں تیانن من اسکوائر جیسا خطرناک کھیل نہیں کھیلا جا سکتا ہے۔ یہ چند لوگ، جنھوں نے وادی میں قیام کیا، اس لیے نہیں رُکے کیونکہ انھیں کسی خطرے کا اندیشہ نہ تھا بلکہ انھیں ثبات سے بے ثباتی کی جانب سفر کرنا گوارا نہیں تھا۔ ان لوگوں کو پناہ گزین بننا اور در در کی ٹھوکریں کھانا موت کو گلے لگانے یا مذہب تبدیل کرنے سے بدتر لگ رہا تھا۔

نامساعد حالات کے باوجود ڈاکٹر مہک ملِک اپنے تعمیری پروجیکٹ پر ڈٹی رہی۔ اس کی زندگی کا ایک ہی مقصد رہ گیا تھا اور وہ تھا ان بیمار ذہن لوگوں کو آئینہ دکھانا جنھوں نے ماضی میں اپنی سنکی تخریبی کارروائیوں کو سرانجام دینے کی خاطر اس کے معصوم اور نہتے والدین کو اپنی نفرتوں کا ہدف بنایا۔ ایسے ماحول میں اسپتال کی تعمیر کرنا ان تباہ کن عناصر کے لیے ایک کرارا جواب تھا یعنی اللہ کی تخلیق کی گئی اس کائنات میں تخریب کی نہیں بلکہ تعمیر کی اشد ضرورت ہے۔

اسپتال کو مکمل ہوئے ابھی چھ مہینے بھی نہیں ہوئے تھے کہ لالہ دین دیال سورگ سدھار گئے۔ اس کی نوکرانی نے ٹیلی فون پر ڈاکٹر مہک ملِک کو اطلاع دی۔ ڈاکٹر مہک اور گوتم سپرو

دونوں فوراً متوفی کے مکان پر پہنچ گئے۔ انھوں نے ریڈیو، دوردرشن اور روزنامہ ایکسلشئیر جموں میں خبر دی تا کہ رشتے داروں کو پتہ چلے اور مردے کا داہ سنسکار کرنے کے لیے ایک دن انتظار کیا۔ ان کوششوں کے باوجود مرحوم کے وارثوں کا کہیں کوئی اتا پتا نہیں ملا۔ اس کے علاوہ آخری رسومات ادا کرنے کے لیے کوئی پروہت بھی دستیاب نہ ہوا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ دین دیال کا انتم سنسکار کس طرح کیا جائے۔ چند پڑوسیوں نے ڈاکٹر مہک ملِک کی ڈھارس بندھائی کہ وہ کسی طرح کی چنتا نہ کرے، ہم ارتھی کو شمشان گھاٹ تک پہنچا دیں گے۔ انھوں نے نزدیکی شمشان گھاٹ سے ارتھی منگوائی، لاش کو نہلایا اور پھر احترام سے ارتھی پر رکھ دیا۔ گوتم سمیت چار آدمیوں نے ارتھی کو کندھا دیا اور اسپتال کی ایمبولنس میں رکھ کر شمشان گھاٹ تک پہنچا دیا۔ وہاں مردے کو چتا پر رکھ کر داہ کرمی کے منتروں کے درمیان گوتم سپرو نے دین دیال کا انتم سنسکار کیا اور چتا کو اگنی دکھائی۔ دوسرے روز یہ خبر اخبارات و دیگر ذرائع ابلاغ میں سرخی بن گئی کہ 'ہندو لالہ دین دیال کی ارتھی کو مسلمانوں نے کندھا دے کر شمشان گھاٹ تک پہنچایا جہاں اس کا داہ سنسکار کیا گیا'۔ ارتھی کے فوٹو بھی چھاپے گئے اور ساتھ میں یہ بھی ہائی لائٹ کیا گیا کہ کشمیر میں ابھی بھی فرقہ وارانہ ہم آہنگی بدستور قائم ہے اور خون خرابے کے باوجود ہندوؤں اور مسلمانوں میں آپس میں خون سفید نہیں ہوا ہے۔

ڈاکٹر مہک ملِک چاہتی تھی کہ اس نیک انسان کی ارتھی کے ساتھ وہ بھی جا کر اسے آخری الوداع کہہ دے مگر رسم مانع تھی کیونکہ خواتین کو شمشان گھاٹ جانے کی اجازت نہیں ہے۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا بہہ رہا تھا۔ اسے رہ رہ کر اپنے والدین کی یاد آ رہی تھی۔ گذشتہ کچھ برسوں میں لالہ دین دیال اور ڈاکٹر مہک کے درمیان باپ بیٹی کا رشتہ قائم ہو چکا تھا اور وہ لالہ دین دیال کی خوب دیکھ بھال کرتی تھی۔ گاہ بہ گاہ گھر جا کر اس کے کھانے پینے، لباس اور صاف صفائی کی نگرانی بھی کرتی تھی۔ اب اس کے دیہانت کے بعد ڈاکٹر مہک نے لالہ کی نوکرانی کو اپنے اسپتال میں ملازم رکھ دیا۔ لالہ دین دیال کے رخصت ہونے کے بعد ڈاکٹر مہک کو زندگی

میں دوبارہ ایک خلا کا احساس ہونے لگا اور وہ اکثر تنہا تنہا اپنے وجود کی بے ثباتی پر متفکر ہو جاتی۔

(۳۱)

ماضی میں جب دہشت گردی کے باعث کشمیری پنڈت اجتماعی طور پر وادی سے نقل مکانی کرنے پر مجبور ہو گئے، گوتم سپرو نے ہجرت کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ بہنیں سُسرال میں تھیں اور سُسرال والوں کے ساتھ ہی وادی چھوڑ کر چلی گئیں۔ انھوں نے بہت کوشش کی کہ بھائی کو بھی اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ وادی چھوڑ کر کہیں اور سکونت اختیار کر لے مگر اس نے صاف انکار کر دیا۔ اس کی ماں جے کشوری کے پاس بیٹے کے پاس رہنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا لیکن وہ کچھ وقت کے بعد ہی داغ مفارقت دے کر چلی گئی۔

گوتم کو شادی کرنی ہی نہیں تھی تو پھر زندگی میں باقی رہا کیا تھا....؟ کس لیے وادی چھوڑ کر چلا جاتا....؟ اسکول کو خیر باد کہہ کر وہ اسپتال کی دیکھ ریکھ کے ساتھ جڑ گیا، عمارت کے مختلف بلاکوں کی تعمیر کے لیے دوڑ دھوپ کرتا رہا، اسپتال کے انتظام وانصرام پر کڑی نگاہ رکھتا، یہاں تک کہ جب تک اسپتال شفٹ نہیں ہوا تب تک اس کا حساب کتاب بھی خود ہی رکھ لیتا۔ اسپتال شفٹ ہونے کے بعد اکاؤنٹ کا کام اتنا پیچیدہ ہو گیا کہ اب اس کے بس کی بات نہیں رہی۔ ہر شعبے میں ماہر پیشہ وروں کی تقرری کی گئی، وہ چاہے ٹیکنکل شعبے تھے یا غیر ٹیکنکل۔ اس لیے اکاونٹس شعبے میں بھی سند یافتہ اکاونٹنٹ کو ملازم رکھا گیا۔ اس کے علاوہ ایک پارٹ ٹائم چارٹرڈ اکاونٹنٹ کی خدمات بھی حاصل کی گئیں۔

اسپتال میں گوتم اور مہک ایک دوسرے کے زیادہ قریب نہیں آتے تھے۔ صرف اہم مسئلوں پر ڈاکٹر مہک ملِک گوتم سپرو کو بلاتی اور اس سے صلاح مشورہ کر لیتی۔ گوتم سپرو اس بندوبست سے خوش تھا کیونکہ وہ ڈاکٹر مہک کی نیک نامی پر کسی قسم کی آنچ آنے کے سخت خلاف

تھا۔ البتہ جب کبھی ایک دوسرے کی یاد آتی تو رات میں ٹیلی فون پر رابطہ کر لیتے اور اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتے۔

اسی دوران گوتم سپرو کو ایک کے بعد ایک، دو خطوط موصول ہوئے جو کسی ملی ٹنٹ تنظیم کے آفیشل پیڈ پر لکھے ہوئے تھے۔ سب سے اوپر دائیں طرف تنظیم کا لوگو اور نام چھپا ہوا تھا مگر ایڈریس ندارد۔ اس کے بعد ہاتھ سے لکھی ہوئی عبارت تھی۔ دونوں خطوط میں صاف طور پر لکھا ہوا تھا کہ اسپتال کے ساتھ تمہارا تعلق کئی شکوک وشبہات پیدا کرتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ تم یہاں کیوں رہ رہے ہو جبکہ تمھاری ساری برادری وادی سے ہجرت کر چکی ہے۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر مہک ملِک کے ساتھ تمھارا کیا رشتہ ہے؟ بہتر یہ رہے گا کہ تم جلد از جلد وادی چھوڑ کر چلے جاؤ ورنہ تمھیں اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔

ان دھمکیوں کا گوتم پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے ان خطوط کے بارے میں ضمنی طور پر ڈاکٹر مہک سے ٹیلی فون پر بات کرنا چاہی مگر اس نے روک لیا اور ہدایت کی کہ آج کل میرے ٹیلی فون پر کڑی نگرانی رکھی جا رہی ہے اس لیے یہ بات روبرو ہی کر لیں تو بہتر رہے گا۔

اتوار کی صبح گوتم سیدھے مہک کی رہائش گاہ پر پہنچ گیا۔ وہاں دیکھا کہ بہت کچھ بدل گیا ہے۔ وہ حیرت میں پڑ گیا۔ جس طرح سے وہ ہر چیز کو غور سے دیکھ رہا تھا، ڈاکٹر مہک کو اس کے تجسس کا احساس ہوا اس لیے وہ خود ہی گویا ہوئی۔ ''تم یہاں میرے گھر بہت دنوں سے نہیں آئے ہو اور نہ میں نے تمھیں بلانے کی کوشش کی کیونکہ حالات بہت نازک ہیں۔ گوتم میں بہت ہی کٹھن دور سے گزر رہی ہوں۔ میری ہر حرکت پر نظر رکھی جا رہی ہے۔ اسپتال پر بھی جاسوسی کی جا رہی ہے۔ میں تمھیں اس بارے میں بتانا ہی چاہتی تھی مگر مناسب موقع نہیں مل رہا تھا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں کسی نے تم کو یہاں آتے ہوئے نہ دیکھا ہو اور یہ خبر اپنے آقاؤں تک پہنچا دی ہو۔''

''کیوں، ایسا کیا ہوا؟''

''اسپتال کے بارے میں افواہ پھیلائی گئی ہے کہ اس کے ایک بلاک کا نام کسی کافر سے منسوب کیا گیا ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ ملی ٹنٹ اس اسپتال کو بموں سے اڑانا چاہتے ہیں۔ کئی ڈاکٹر جن پر مجھے ناز تھا وہ اسپتال تو کیا، وادی چھوڑ کر چلے جارہے ہیں۔ کوئی دبئی جارہا ہے اور کوئی انگلینڈ۔ ایسا سمجھ لو کہ اسپتال اچھے ڈاکٹروں اور نرسوں سے خالی ہونے لگا ہے۔ میں بالکل اکیلی پڑ گئی ہوں۔ لگتا ہے کہ مجھے کئی شعبے بند کرنے پڑیں گے تاکہ اسپتال کی مالی حالت زیادہ خراب نہ ہو اور یہ کسی طرح چلتا رہے۔ میں اس طرح اپنے خوابوں کو پراگندہ ہوتے نہیں دیکھنا چاہتی ہوں۔ مجھے نہ جانے کیوں ڈر سا لگتا ہے۔ تمھارے بارے میں سوچتی ہوں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ گوتم میری صلاح مانو تم بھی جموں جا کر وہیں پر سیٹل ہو جاؤ۔ میں تمھیں کھونا نہیں چاہتی۔ میری چنتا مت کرو، میں کسی بھی صورت میں اسپتال چلا لوں گی۔ میرا مستقبل اس اسپتال کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ یہ مجھے ہر دم میرے والدین کی شہادت کی یاد دلاتا ہے۔ اس کے ہر ذرّے میں ان کی روح بسی ہوئی ہے۔ یہ اسپتال معاندت میں تعمیر کا علامیہ بن چکا ہے، اس لیے میں اسے بچانے کی حتی المقدور کوشش کروں گی۔ یہ ایک دھرتی کی بیٹی کا عزم ہے جو کشمیر کو خوشحال اور آسودہ حال دیکھنا چاہتی ہے۔''

گوتم جو اپنی رام کہانی سنانے آیا تھا، اسے بھول ہی گیا۔ مہک کے لہجے سے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ٹوٹ سی گئی ہے، بکھر سی گئی ہے۔ وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ ڈاکٹر مہک بول اٹھی۔ ''ہاں تو گوتم، تم کس لیے آئے تھے؟ تم کچھ کہنا چاہتے ہو۔''

''مہک، چھوڑو ان باتوں کو۔ کوئی خاص بات نہیں ہے۔''

''نہیں نہیں، بتاؤ تو.... اس روز میں نے تمھیں ٹیلی فون پر بتانے سے اس لیے منع کیا تھا کہ مجھے پتہ چلا ہے کہ ہمارے سبھی ٹیلی فونوں پر پہرے بٹھائے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں اب تمھیں ٹیلی فون بھی نہیں کرتی۔ مجھے کچھ دال میں کالا نظر آرہا ہے۔ ان دہشت گردوں نے اپنا جال سبھی محکموں میں پھیلایا ہے۔ وہ ان کو سبھی خبریں پہنچا دیتے ہیں۔ مجھے شک ہو رہا ہے کہ

اسپتال میں بھی ان کے مخبر ہیں۔"

"ہاں مجھے معلوم ہے۔ خیر تمھیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہو سکے تو چیف سیکریٹری یا ڈی جی پی سے بات کرلو، وہ اسپتال کے اردگرد سیکورٹی کا انتظام کروائیں گے۔"

"ٹھیک ہے، میں کوشش کروں گی۔ خیر اپنی بات تو بتاؤ۔"

گوتم نے اپنی جیب سے دونوں خط برآمد کیے اور مہک کے سامنے رکھ دیے۔ اس نے خط پڑھ لیے اور خود ہی سب کچھ سمجھ گئی۔ پھر پوچھنے لگی۔ "اس دھمکی کو پڑھ کر تم نے کیا فیصلہ کیا؟"

"مجھے تو کہیں نہیں جانا۔ میں تو کشمیر میں پیدا ہوا ہوں اور یہیں مر جاؤں گا۔ وہ چاہے آج مروں یا دس سال بعد۔ اگر بھگوان نے میری موت ان ملی ٹنٹوں کے ہاتھوں لکھی ہوگی تو یہی سہی۔"

"کم سے کم اسپتال آنا تو بند کر دو مہینے دو مہینے کے لیے۔"

"نہیں، پھر تو انھیں یقین ہو جائے گا کہ میں ان کی دھمکیوں سے ڈر گیا۔ میرے بعد وہ تم کو نشانہ بنائیں گے۔ مجھے نہیں لگتا کہ یہ ٹھیک رہے گا۔ میں اسپتال جاتا رہوں گا اور اپنا کام کرتا رہوں گا۔ تمھیں بتانے کا مقصد صرف تم کو چوکنا کرنا تھا تاکہ تم خبردار رہو اور احتیاط برت لو۔"

گوتم نے کافی پی کر مہک سے رخصت لی اور اپنے گھر واپس چلا گیا۔

(۳۲)

کچھ دنوں کے بعد دو ملی ٹنٹ منہ پر ڈھاٹا باندھے رات کے دس بجے اسپتال میں گھس آئے۔ اس وقت ڈاکٹر مہک ملک ایمرجنسی کیس کی وجہ سے اسپتال میں موجود تھی۔ ایک حاملہ عورت کی ڈیلوری کا ٹائم ہو رہا تھا اور اس کا آپریشن کرنا ضروری تھا۔ جونہی ڈاکٹر مہک آپریشن تھیٹر سے باہر نکلی اس کے سامنے پھرن پہنے ہوئے اور منہ چھپائے ہوئے دو ملی ٹنٹ کھڑے ہو گئے۔

ڈاکٹر مہک ملک کو تعجب ہوا کہ سیکورٹی کے باوجود وہ کس طرح اسپتال میں گھس آئے تھے۔ دونوں نے پھرن کے اندر ہتھیار چھپائے تھے جن کی انھوں نے ڈاکٹر ملک کے سامنے نمائش کی۔ ان کی منشا تھی کہ اسپتال میں کہیں انھیں چھپنے دیا جائے کیونکہ سیکورٹی فورسز ان کا تعاقب کر رہے تھے۔ اس سے پہلے بھی وادی کے چند اسپتالوں میں ملی ٹنٹوں کے چھپنے اور سیکورٹی فورسز کے ساتھ ان کی جھڑپ کی وارداتیں پیش آئی تھیں جن کی وجہ سے مریضوں کی جانیں خطرے میں پڑ چکی تھیں۔ ایک اسپتال کو تو دہشت گردوں نے ہتھیاروں و گولی بارود ذخیرہ کرنے کا گودام بنایا تھا۔ چونکہ رات کے دس بج چکے تھے اسپتال میں ڈاکٹر مہک ملک کے علاوہ بہت کم اسٹاف تھا، اس لیے اسے کچھ ڈر سا محسوس ہونے لگا۔ پھر بھی نہ جانے کہاں سے اسے کسی غیبی طاقت نے ہمت عطا کی اور اس نے مسلح نوجوانوں کو ٹوک کر کہا۔ ''یہ اسپتال ہے کوئی رزم گاہ نہیں، اسپتال ان کاموں کے لیے نہیں ہوتا۔ یہ اسپتال مریضوں کو صحتیاب کرنے کے لیے بنا ہوا ہے، ان کی جانیں خطرے میں ڈالنے کے لیے نہیں۔ میں نے اس اسپتال کی تعمیر کے لیے اپنی زندگی وقف کی ہے۔ اس لیے بہتر یہ ہوگا کہ آپ لوگ کسی اور جگہ جا کر چھپنے کی کوشش کریں اور آئندہ کبھی اس اسپتال کی طرف رخ نہ کریں۔''

ان میں سے ایک ملی ٹنٹ کچھ زیادہ ہی طیش میں آ گیا، کہنے لگا۔ ''تمھیں اندازہ نہیں ہے کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ بعد میں بہت پچھتاؤ گی۔''

ڈاکٹر مہک ملک کو نہ جانے اللہ نے کیسی جرأت بخشی۔ اس نے بڑے اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔ ''میں صرف ایک ڈاکٹر ہی نہیں بلکہ اس اسپتال کی ناظم بھی ہوں اور اپنا فرض اچھی طرح جانتی ہوں۔ یہ اسپتال میں نے اپنے خون پسینے سے عوام کی بہبودی کے لیے بنوایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب بھی میری موت لکھی ہوگی اور جس کے ہاتھوں بھی لکھی ہوگی، اسے کوئی ٹال نہیں سکتا۔ اس لیے ایسی دھمکیوں سے مجھ پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ اگر آپ لوگوں کو کہیں دل کے کسی کونے میں غریب کشمیری عوام کے لیے ذرا سی بھی ہمدردی ہو تو آج کے بعد کبھی کسی اسپتال کی

طرف مت دیکھنا۔"

"ڈاکٹر، آپ کو اس میں حرج ہی کیا ہے اگر ہم کچھ دیر کے لیے یہاں کہیں چھپ جائیں گے تا کہ پولیس ہمیں ڈھونڈنے میں کامیاب نہ ہو۔ موقع ملتے ہی ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔" دوسرا ہتھیار بند نوجوان دھیمے لہجے میں بول اٹھا۔

"اسپتال کوئی جائے پناہ نہیں ہے۔ یہاں پر غریب مظلوم عوام کا علاج ہوتا ہے، ان کی تیمار داری ہوتی ہے اور انھیں صحت یاب کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اسپتال میں یہ نہیں دیکھا جاتا ہے کہ مریض دوست ہے یا دشمن، ہندو ہے یا مسلمان، سکھ ہے یا عیسائی، یہاں سب برابر ہوتے ہیں اور سب کا علاج تندہی سے ہوتا ہے۔ میری درخواست ہے کہ کم سے کم مریضوں پر کچھ تو رحم کرو۔ کہیں پولیس کے کانوں میں بھنک پڑ گئی اور انھوں نے اس اسپتال کا محاصرہ کر کے محاربہ کیا، تو مریضوں کی جانیں خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ اس لیے بہتر یہی رہے گا کہ تم عقبی دیوار پھاند کر چلے جاؤ اور یہاں قیام کرنے کا ارادہ دل سے نکال دو۔"

اس کے بعد دونوں اسلحہ بردار پچھلی دیوار پھاند کر نہ جانے اندھیرے میں کہاں گم ہوگئے۔ لیکن معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہوا۔ اس واقعہ کے بعد ان کی تنظیم کے دھمکی بھرے خطوط موصول ہونے لگے جن کی طرف ڈاکٹر مہک نے زیادہ توجہ نہیں دی۔ اس نے کئی بھروسے مند صلاح کاروں سے مشورہ کیا مگر سب کی رائے یہی تھی کہ اس واقعے کو نظر انداز کرلیں کیونکہ تھانے میں ایف آئی آر کرنے سے اسپتال دہشت گردوں کی آنکھوں کا کانٹا بن جائے گا۔ نیتجتاً ڈاکٹر مہک نے نہ تو پولیس کو خبر کی اور نہ ہی متعلقہ انتہا پسند تنظیم سے رابطہ کیا۔

اکیلی جان ہونے کے سبب اس واقعے کے بعد ڈاکٹر مہک کے دل میں کئی وسوسے پیدا ہوتے رہے۔ کئی بار اس کے ذہن میں سوال پیدا ہوا کہ کہیں میں نے سرینگر میں اسپتال بنا کر غلط فیصلہ تو نہیں لیا۔ کہیں میرا فیصلہ معقولیت کے بجائے جذباتی تو نہیں تھا؟ اس نے گوتم کو بھی ٹیلی فون نہیں کیا۔ اس کو شک ہو رہا تھا کہ اس کے ٹیلی فون پر بھی نگرانی رکھی جا رہی ہے اور کہیں گوتم کو

کوئی گزند نہ پہنچائے۔اس لیے خاموشی سے سب کچھ اکیلے ہی جھیلتی رہی۔

اُدھر کئی روز سے سیکورٹی فورسز نے اینکاونٹر کرنے کی کارروائی تیز کردی۔ ٹیلی ویژن پر ان ملی ٹنٹوں کی تصویریں دکھائی جا رہی تھیں جو دہشت گردی میں ملوث تھے اور جن کی تلاش پولیس کر رہی تھی۔ وہ سب جنگی لباس میں ملبوس اور ہاتھ میں کلاشنکوف رائفلیں لیے نظر آرہے تھے۔ ٹیلی ویژن دیکھتے ہوئے ڈاکٹر مہک کی نظر اچانک ایک جنگجو پر پڑی جس نے ڈاڑھی رکھی تھی اور سر پر کالی رومال باندھ رکھی تھی۔ڈاکٹر مہک اس کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگی۔ کچھ دیر دماغ پر زور دے کر آخر کار اس نے صورت پہچان لی۔ وہ خالد بیگ تھا جو کئی مہینوں سے غائب تھا۔ سرحد پار کر کے وہ پھر واپس آچکا تھا اور اب دوبارہ حرکت میں آیا تھا۔ اس کے بارے میں قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں اور اسے ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی جارہی تھی۔ پولیس کو خبر ملی تھی کہ وہ کوئی بڑی واردات کرنے کی فراق میں ہے۔

جب سے اسپتال کے گردونواح میں سیکورٹی فورسز اور ملی ٹنٹوں کے درمیان جھڑپیں ہونے لگی تھیں، عام مریضوں کے بدلے یہاں اکثر و بیشتر گھائل اور زخمی مریض لائے جا رہے تھے۔ کچھ زخمیوں کے ساتھ پولیس بھی آتی تھی جو ان پر نگرانی رکھتی تھی۔ڈاکٹر مہک ملِک کو اس شعبے میں اسٹاف کی کمی کا احساس ہوا، اس لیے کچھ نئے تربیت یافتہ ڈاکٹر اور نرسیں بھرتی کرلیں اور اس شعبے پر زیادہ فوکس کرنے لگی۔ بھلا ہو سینئر ڈاکٹر شفیق نجار کا اس نے حتی الامکان مدد کی۔شاید اس کو ڈاکٹر مہک ملِک کی حالت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اس نے ایک روز موقع پا کر ڈاکٹر مہک ملِک کو دلاسہ دیا۔ ''میڈم، آپ پریشان نہ ہوں، ایسے موقعے تو ڈاکٹروں کی زندگی میں کئی بار آتے ہیں۔ وہ سوچ ہی نہیں پاتا ہے کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔لیکن اچھے ڈاکٹر کے لیے یہی ایک موقع ہوتا ہے جب وہ اپنی قابلیت، ہمہ گیری اور صبر و تحمل کا مظاہرہ کرسکتا ہے۔''

''مجھے اس بات کی فکر نہیں ہے کہ موجودہ حالات میں اسپتال کس طرح چلے گا، چلے گا

بھی یا نہیں کچھ کہہ نہیں سکتی البتہ کچھ واقعات ایسے رونما ہوئے ہیں کہ میں کچھ سمجھ نہیں پا رہی ہوں۔''

''جیسے.....؟''

''آپ نے تو سنا ہی ہوگا کہ ایک رات دو بندوق بردار اسپتال میں گھس آئے تھے اور یہاں پناہ لینا چاہتے تھے مگر میں نے انھیں منع کر دیا۔ وہ خفا ہوکر اور مجھے تنبیہ کر کے چلے گئے۔ اس روز کے بعد مجھے کئی چٹھیاں موصول ہوئیں جن میں مجھے جان سے مارنے کی دھمکیاں ملی ہیں۔''

''ایسا تو ہونا نہیں چاہیے۔ ان لوگوں کو آپ سے اور آپ کے اسپتال سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔ اس اسپتال میں کوئی ایسا کام تو ہوتا نہیں جو ان کے وجود کے لیے خطرہ ہو۔''

''یہی تو میرے ادراک سے باہر ہے، ایک یہی اسپتال ان کی آنکھوں کا کانٹا کیوں بنا ہوا ہے؟''

''ہوسکتا ہے کہ کسی کو آپ کے ساتھ ذاتی رنجش ہو یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ کسی اندر کے آدمی کی کارستانی ہو۔ ہاں یہ بھی ممکن ہے کہ کسی ہم پیشہ کی کارستانی ہو جس کو انگریزی میں پروفیشنل جیلسی (Professional jealousy) کہتے ہیں۔''

''یو آر رائٹ۔ پیشہ ورانہ رقابت ہوسکتی ہے....! مگر میں نے کسی کو کبھی نقصان نہیں پہنچایا ہے، پھر کوئی مجھے زک پہنچانے کی کوشش کیوں کرے؟''

''مجھے اپنے کیرئر میں کئی ایسے ڈاکٹروں سے واسطہ پڑا ہے جو ہر موڑ پر مجھے زک پہنچانے کی کگار پر کھڑے رہتے تھے۔ مگر میں ان کو نظر انداز کرتا تھا۔ دنیا میں جینا ہے تو ایسی مسابقت کا سامنا تو کرنا ہی پڑے گا۔ لوگ نہ تو خود کوئی جوکھم اٹھانا چاہتے ہیں اور نہ محنت کرنا چاہتے ہیں، صرف اس لیے پریشان رہتے ہیں کہ دوسرے ہم پیشہ لوگ ان سے زیادہ مقبول کیوں ہیں؟ اب اس میں ہم کیا کر سکتے ہیں۔ کشمیر کے جو حالات ہو رہے ہیں وہ ہمیں اکیسویں صدی

کے بدلے قرونِ وسطیٰ کی جانب لے جا رہے ہیں۔ہم نے چاہے جتنی بھی ترقی کی ہے وہ سب اکارت ہو رہی ہے۔''

''میں آپ کی باتوں سے اتفاق کرتی ہوں۔ مجھے ایم ڈی کرنے کے بعد کئی کیریئر آپشن تھے مگر اپنے مادرِ وطن کا پیار مجھے یہاں کھینچ لایا اور میں نے یہ جوکھم اٹھایا۔میں نے اپنے والدین کو بھی کھو دیا۔ان سنگدل وحشیوں نے ان کو بھی نہیں چھوڑا۔''

''ایسے لوگوں کو ان باتوں کی کہاں فکر ہوتی ہے۔اعلیٰ انسانی قدریں ان کے لیے فضول ہوتی ہیں۔تبلیغ کی باعث ان کا سر پھر جاتا ہے۔وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ کشمیر کو پاکستان کا حصہ بنا کر ہی چھوڑیں گے۔ یہاں شرعی قانون نافذ ہو جائے گا۔لیکن معاملہ کشمیریوں کے ہاتھ سے کب کا نکل چکا ہے۔اس میں تم اور میں کچھ بھی نہیں کر سکتے۔انھوں نے نئی نسل کو ورغلایا ہے کہ اگر وہ کمر کس لیں تو آزادی آج نہیں تو کل مل ہی جائے گی۔ بقول ان کے جو لوگ اس جہاد میں شہید ہوں گے ان کے لیے جنت کے دروازے ہمیشہ کھلے رہیں گے۔

''کیا پاکستان میں لوگ شرعی قانون کے پابند ہیں؟ کیا وہ ایک آئیڈیل اسلامک اسٹیٹ کہلانے کے لائق ہے؟ کیا وہاں عورتیں حجاب کے بغیر گھر سے باہر نہیں نکلتیں؟ کیا وہاں پر خواتین کے لیے اسکول، کالج اور یونیورسٹیاں نہیں ہیں؟ میں نے تو یہاں تک سنا ہے کہ وہ ہندوستانی فلمیں دیکھنے کے لیے بے قرار رہتے ہیں۔ بیوٹی پارلروں میں امیر اور متوسط طبقے کی خواتین کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔اعلیٰ فوجی افسروں کی پارٹیوں میں ڈانس، شراب نوشی اور عریانیت کا کھلے عام مظاہرہ ہوتا ہے۔ پھر یہ سب پابندیاں کشمیریوں پر ہی کیوں عائد ہوتی ہیں؟ مجھے لگتا ہے کہ یہ ہم سے کشمیریت چھیننے کی سازش ہے۔ ہماری چھ ہزار سال کی وراثت کو دفن کرنے کی کوشش ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مستقبل میں کشمیر تاریکیوں میں اپنی تہذیب ٹٹولتا پھرے گا۔''

''آپ کی بات صحیح ہے۔مگر شرپسندوں کے ہاتھوں میں بندوق دیکھ کر عبقریوں کے منہ

پر تالے لگے ہوئے ہیں۔ شروع شروع میں بہت سارے لوگ اس بات پر یقین کرنے لگے کہ آزادی بس اگلے موڑ پر ہمارا انتظار کر رہی ہے، انھوں نے لمبے لمبے جلوس نکلتے دیکھ لیے، وادی سے ہندوؤں کا انخلا دیکھ لیا، سیکورٹی فورسز پر ایک کے بعد ایک حملے ہوتے دیکھ لیے تو سمجھ لیا کہ ہم آزاد ہو گئے۔ انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ ہمیں آزادی پانے کے لیے ایک سو دس کروڑ آبادی والے ملک سے لوہا لینا پڑے گا۔ پھر جوں جوں معاملہ ٹھنڈا پڑتا چلا گیا دانش وروں اور سیاست دانوں نے کنارہ کر لیا اور اب یہ لڑائی صرف جنگجوؤں اور فوج کے درمیان لڑی جا رہی ہے۔ اب آئے روز ایک طرف پاکستان سے آئے تربیت یافتہ ملی ٹنٹ مارے جاتے ہیں اور دوسری طرف سیکورٹی فورسز کے جوان۔ اور کار جہاں یوں ہی چل رہا ہے۔''

''خیر اب مجھے جانے کا ٹائم ہو گیا۔ آپ اسپتال کا خیال رکھ لیں اور کوئی پریشانی ہو تو مجھے فوراً اطلاع دیں۔'' یہ کہہ کر ڈاکٹر مہک ملک گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔

(۳۳)

کچھ عرصے کے بعد ایک برقع پوش عورت چیک اپ کرانے کی غرض سے ڈاکٹر مہک ملک کے سامنے حاضر ہوئی۔ نقاب اٹھاتے ہی ڈاکٹر صاحبہ نے اسے پہچان لیا اور اپنائیت کے ساتھ اسے مخاطب ہوئی۔ ''ساحرہ.....تم! کیسی ہو؟ سب خیریت تو ہے نا؟''

ڈاکٹر مہک ملک نے دو کپ چائے منگوائی اور اس کو آرام سے سامنے کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔

''ہاں ڈاکٹر صاحبہ، سب خیریت ہے۔ سوچا جانچ بھی کراؤں گی اور آپ سے ملاقات بھی ہوگی۔''

''تم مجھے ڈاکٹر صاحبہ مت کہا کرو، تم تو میری چھوٹی بہن کے برابر ہو۔''

ڈاکٹر مہک ملِک نے اس کو معاینہ میز پر لٹا کر پوری طرح ملاحظہ کیا اور سب کچھ نارمل پایا۔

اتنی دیر میں چائے بھی آ گئی اور دونوں چائے نوش فرمانے لگے۔

ڈاکٹر مہک ملِک نے بیٹے کے بارے میں پوچھا۔ ''بیٹا کیسا ہے؟ اب تو ماشا اللہ گھٹنوں کے بل چلتا ہوگا۔''

''آپا، پوچھومت، کافی شرارتی ہوگیا ہے، بہت تنگ کرتا ہے۔''

''اس کا باپ بھی بہت شریر تھا۔'' دونوں کی ہنسی چھوٹ گئی۔

''نام کیا رکھا ہے؟''

''عادل۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ بڑا ہو کر انصاف پرور بنے۔''

''بہت اچھا نام رکھا ہے۔ اللہ اس کی عمر دراز کرے۔''

کچھ وقفے کے بعد ساحرہ نے بھیدی نگاہوں سے چاروں طرف نظر دوڑائی اور اطمینان کیا کہ کہیں کوئی کمرے میں موجود تو نہیں ہے یا پھر دروازے کے آڑ میں ان کی باتیں تو نہیں سن رہا ہے۔ پھر رازدارانہ لہجے میں گویا ہوئی۔ ''آپا، دراصل میں کسی چیک اَپ کے لیے نہیں آئی ہوں۔ مجھے شک ہو رہا ہے کہ خالد اور اس کی ماں ابھی تک اپنی بے عزتی بھلا نہیں پائے ہیں۔ وہ تم سے بدلہ لینے کی تاک میں ہیں، چاہے تمھارے زندہ رہتے ہوئے یا پھر تمھاری موت کے بعد۔ انھیں تمھاری جائیداد ہڑپنے کا لوبھ ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ وہ تمھارے بارے میں پل پل کی جانکاری حاصل کرتے ہیں اور تمھیں کسی طرح بدنام کرنے کے چکر میں ہیں۔

انھیں معلوم ہوا ہے کہ اس اسپتال کے لیے کسی ہندو نے تمھیں زمین بطور تحفہ دی ہے۔ وہ یہ بات ہضم نہیں کر پا رہے ہیں۔ اس لیے انھوں نے حقیقت جاننے کے لیے جاسوس لگا رکھے ہیں۔ وہ کون تھا اور تمھارے ساتھ اس کا کیا رشتہ تھا؟ ان کا ماننا ہے کہ کوئی یوں ہی کسی کو اتنی زمین

مفت میں تھوڑے ہی دیتا ہے۔اس کے علاوہ کسی کشمیری پنڈت سے تمھارے تعلقات ہیں جس نے ہجرت نہیں کی اور وادی میں ہی رہ رہا ہے۔اس نے اسپتال کی تعمیر میں تمھاری مدد کی ہے اور اسپتال میں کام کر رہا ہے۔اکثر تمھارے پاس آتا جاتا ہے۔وہ اس بات کی بھی کھوج لگا رہے ہیں کہ اس کے ساتھ تمھارا کیا رشتہ ہے؟

آپا، شاید تمھیں معلوم ہوگا کہ خالد پاکستان جا کر عسکری تربیت پا کر واپس آیا تھا اور اس نے ایک نئی تنظیم 'الجہاد کشمیر' بنائی اور کچھ مہینوں تک سرگرم رہا۔ پولیس کو اپنی سراغ رساں ایجنسی کے توسل سے اس کے بارے میں پتہ چلا اور وہ اس کا تعاقب کرنے لگی۔اس کا فوٹو ٹیلی ویژن پر کئی بار دکھایا گیا جس پر لکھا گیا تھا کہ سیکورٹی فورسز کو اس کی تلاش ہے۔ہوسکتا ہے کہ آپ نے دیکھا بھی ہو مگر پہچانا نہ ہو کیونکہ اس نے ڈاڑھی رکھی تھی اور اس کا لباس بالکل مختلف تھا۔فوٹو میں وہ جنگی لباس پہن کر، سر پر ایک کالا رومال باندھے اور ہاتھ میں ایک اے کے فورٹی سیون لیے کھڑا ہے۔ مسلسل تلاشیوں کی وجہ سے وہ بہت عرصہ تک روپوش ہونے پر مجبور ہوگیا۔اِدھر میری سسرال پر دن رات پہرا بٹھایا گیا اور ہم لوگوں کی نقل وحرکت پر بھی نظر رکھی جانے لگی۔ایک روز میں برقع پہن کر چوری چھپے سورج طلوع ہونے سے بہت پہلے گھر سے نکلی اور نظریں بچا کر اپنے میکے پہنچ گئی۔خالد کو نہ جانے کیسے خبر ملی کہ میں میکے میں ہوں اس لیے وہاں مجھ سے ملنے آتا تھا اور رات بھر وہیں رہتا تھا۔ چنانچہ میں نے لوگوں سے تمھاری کافی تعریفیں سنی تھیں، اس لیے میں تمھارے پاس علاج کرانے کے واسطے اپنی ماں کو لے کر آیا کرتی تھی۔انھیں دنوں میرا حمل بھی ٹھہرا۔کچھ مہینوں بعد خالد کا آنا جانا بند ہوگیا۔اور پھر عادل پیدا ہوا۔اس کو دیکھنے کے لیے جمیلہ بٹ کئی بار آئی اور خالد بھی دوبار آیا۔میں نے تمھارے بارے میں ان کو سب کچھ بتادیا مگر وہ نفرت کی وجہ سے میری باتوں پر یقین نہیں کر پا رہے تھے۔

چونکہ خالد 'الجہاد کشمیر' کا سرغنہ ہے، اس نے تمھارے پیچھے کئی جاسوس لگا رکھے ہیں جو اس بات کی تہہ تک پہنچنا چاہتے ہیں کہ اس کشمیری پنڈت کے ساتھ تمھارا کیا رشتہ ہے اور اگر تمھیں

ایک دوسرے سے عشق ہے تو تم دونوں نے آج تک شادی کیوں نہیں کی؟ آپا، تم تو سمجھ دار ہو۔ تمھیں تو معلوم ہونا چاہیے کہ عورت کو پسپا کرنے کے لیے سب سے آسان طریقہ ہے اس کو بدنام کرنا اور اس کے کردار پر کیچڑ اچھالنا۔ یہی کام وہ کرنا چاہتے ہیں اور موجودہ حالات میں وہ اس سے کافی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ مجھے اس بات کی جونہی بھنک پڑ گئی تو دوڑتے دوڑتے تمھارے پاس آئی۔ آگے تم جیسا مناسب سمجھو۔''

اتنا کچھ کہہ کر ساحرہ وہاں سے اٹھ کر چل دی۔ اس نے احتیاطاً ڈاکٹر سے نسخہ بھی بنوایا تاکہ اگر کسی نے اس کو پکڑ لیا یا پھر اس پر شک کیا تو وہ یہ نسخہ دکھا کر چھوٹ سکتی ہے۔ اسپتال سے باہر نکلنے سے پہلے ہی اس نے دوبارہ برقع پہن لیا اور باہر جا کر آٹو میں بیٹھ گئی۔

(۳۴)

دوسرے روز ڈاکٹر مہک ملک نے آفس میں گوتم سپرو کو بلایا۔ اس نے ایک روز پہلے ساحرہ سے ہوئی گفتگو سے گوتم کو آگاہ کیا اور اس کی رائے مانگی۔ گوتم نے بہت سوچ بچار کے بعد کہا۔ ''اگر تم چاہتی ہو تو میں اسپتال آنا بند کر دوں گا۔ ہمارے پاس اور کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔ ورنہ اللہ پر چھوڑ دو، جو اس کی مرضی ہوگی وہ ہو جائے گا۔ مجھے لگتا ہے کہ تمھاری پھوپھی اور اس کے بیٹے کو زندگی نے جس طرح دھتکارا ہے وہ اس کی چبھن برداشت نہیں کر پا رہے ہیں۔ وہ اس شکست کا ٹھیکرا تمہارے سر پر پھوڑنا چاہتے ہیں۔ اب تو مجھے شک ہی نہیں بلکہ یقین سا ہو گیا ہے کہ تمھارا کزن ہی تمھارے والدین کی موت کا ذمہ دار ہے اور ہو سکتا ہے کہ تمھاری پھوپھی کو اس کی جانکاری بھی رہی ہوگی۔''

''ہاں گوتم مجھے بھی ایسا ہی شک ہو رہا ہے۔ وہ محض ایک ایکسیڈنٹ نہیں تھا۔ سوچی سمجھی پلاننگ کے تحت ان پر حملہ کیا گیا تھا۔ اس کو ایکسیڈنٹ جتلانے کے لیے پہلے پولیس پوسٹ پر ہینڈ

گرینیڈ پھینکا گیا اوراس کے بعدان پر جب وہ کار میں گھسنے کی کوشش کر رہے تھے۔''

''جو ہوا بہت برا ہوا، اس کو بھولنا ہی بہتر ہے۔ انسان خود غرضی کے لیے کس حد تک گر سکتا ہے، اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ مجھے تو ایشور کے انصاف پر پورا بھروسہ ہے۔ قدرت کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔''

''ہاں گوتم مجھے بہت افسوس ہو رہا ہے کہ میں یہاں واپس کیوں آئی۔ دہلی میں بہت اچھی نوکری تھی۔ اپنے لوگوں کی خدمت کرنے کی آرزو اور اپنی دھرتی کے احسانات کا تھوڑا بہت حصہ اتارنے کی تمنّا مجھے کھینچ لائی۔ تم بھی تو یہی چاہتے تھے کہ میں یہاں آ کر اپنے لوگوں کی خدمت کروں۔''

''مہک، ہم نے کوئی غلطی نہیں کی۔ تمھارا فیصلہ بالکل صحیح تھا۔ دہشت گردی کے سبب یہاں سے بہت سارے ڈاکٹر خلیجی اور مغربی ممالک چلے گئے جس کے سبب وادی میں شعبۂ صحت میں خلا پیدا ہو گیا تھا۔ اس لیے تمھارا یہ قدم بہت ہی قابل تحسین تھا۔ البتہ تمھاری پھوپھی اور اس کا بیٹا اس کمینگی پر اُتر آئیں گے اس کا مجھے گماں بھی نہ تھا۔ خیر جو ہوا سو ہوا۔ اب ایشور پر چھوڑ دو، جو ہونا ہوگا وہ ہو جائے گا۔''

اس روز گوتم سپرو جب اسپتال سے باہر نکلا، پھرن میں ملبوس ایک نوجوان اس کے قریب آیا اور اس کو اپنا پستول دکھا کر کہنے لگا۔ ''چپ چاپ میرے پیچھے چلتے رہو۔''

گوتم سپرو گھبرا تو گیا مگر ظاہری طور پر خاموش اور پُرسکون نظر آیا۔ اس نے اجنبی سے پوچھا۔ ''بھئی آپ کون ہیں اور مجھے کہاں لے جا رہے ہو۔''

''ابھی پتہ لگ جائے گا۔ بس میرے ساتھ چُپ چاپ چلتے رہو اور زیادہ باتیں مت کرو۔''

''جیسے آپ کی مرضی۔ پر اتنا تو بتاؤ کہ مجھے کس لیے اور کہاں لے جا رہے ہو۔''

''یہ سب کچھ تمھیں وہیں پتہ چل جائے گا۔ یہاں میں کچھ نہیں بتا سکتا۔'' وہ کچھ

قدم آگے کھڑی موٹر سائیکل پر بیٹھ گیا اور اس کو بھی بیٹھنے کے لیے کہا۔ گوتم سپرو موٹر سائیکل پر اس کے پیچھے بیٹھ گیا اور موٹر سائیکل چل دی۔ اس کو محسوس ہوا کہ ایک اور موٹر سائیکل ان کے پیچھے چل رہی ہے۔ پھر موٹر سائیکل ایک گھر کے اندر جا کر رک گئی۔ دونوں گھر کے اندر گھس گئے۔ پھر گوتم کو ایک کمرے میں لے جایا گیا جہاں ایک ڈاڑھی والا نوجوان ان کا انتظار کر رہا تھا۔

''اسلام علیکم، جناب یہ ہے وہ گوتم سپرو جس کے بارے میں آپ نے حکم دیا تھا۔''

''اوہ تو تم ہو گوتم سپرو؟ کہو بھئی کیا حال ہے؟''

''آپ کون؟ مجھے کچھ معلوم تو ہو جائے۔''

''میں یہاں کا ایریا کمانڈر ہوں۔ مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ تم ایک کشمیری پنڈت ہو۔''

''جی ہاں، میں کشمیری پنڈت ہوں۔ وہ تو میرے نام ہی سے ظاہر ہوتا ہے۔''

''کیا کرتے ہو؟''

''میں اسپتال میں ملازمت کرتا ہوں۔ وہاں کے انتظامیہ کا کام مجھے سونپا گیا ہے۔''

''ڈاکٹر مہک ملک سے تمھارا کیا تعلق ہے؟''

''میں اس کا استاد رہا ہوں۔ اس کی فیملی کے ساتھ میرے گہرے تعلقات استوار ہو چکے تھے۔ وہ بے چاری تو تعلیم کے دوران یتیم ہو گئی۔ اس کے والدین بم بلاسٹ میں ہلاک ہو گئے۔ اس کا کوئی رشتہ دار سامنے نہیں آیا، اس لیے میں نے اس کی حوصلہ افزائی کرنا اپنا فرض سمجھا۔ جب اس نے اسپتال بنانے کا منصوبہ بنایا تو میں نے سمجھا کہ یہ ایک فلاحی کام ہے اور اس کے لیے ڈاکٹر صاحبہ کی مدد کرنی چاہیے۔''

''اس نے شادی کیوں نہیں کی؟''

''یہ سوال تو آپ اس سے ہی پوچھ سکتے ہیں۔ اس کا جواب میں کیسے دے سکتا ہوں۔''

''اور تم نے بھی تو شادی نہیں کی ہے۔ کیوں؟''

''جب شادی کرنے کی ٹھان لی تھی اس وقت ماں زندہ تھی ۔ پھراس کی وفات ہوگئی۔ اس کے بعد دل اوب سا گیا اور زندگی کی بے ثباتی کا احساس ہوا۔اس لیے شادی کرنے کی کوئی طلب نہیں رہی۔''

''تم وادی چھوڑ کر جموں کیوں نہیں گئے؟''

''کس لیے جاتا؟ وہاں میرا کوئی نہیں ہے ۔ میری تو صرف ماں تھی وہ بے چاری تو سورگباش ہوگئی۔ پھر جموں جا کر وہاں کیا کرتا۔ سو میں نے فیصلہ کرلیا کہ میری سانسیں جب تک چلیں گی میں یہاں ہی رہوں گا۔''

''دیکھو، آج میں تمھیں وارننگ دے کر چھوڑ رہا ہوں ۔ بہتر یہ رہے گا کہ تم ڈاکٹر سے اپنے تعلقات منقطع کردو۔ وہ مسلمان ہے اور تم ہندو۔ تم دونوں کا کوئی میل نہیں ۔ پھر کیوں خواہ مخواہ تم اپنی اور اس کی زندگی برباد کرنا چاہتے ہو۔''

''دیکھیے ، مجھے اس کے یا اپنے مذہب سے کچھ لینا دینا نہیں ۔ وہ میری شاگرد رہی ہے۔ میں نے اس میں خدمت خلق کی تڑپ دیکھی ، اس لیے انسانیت کی خاطر آگے بڑھ کر اپنا ہاتھ بڑھایا اور اسپتال قائم کرنے میں اس کی مدد کی ۔ یہ اسپتال اس اکیلی عورت نے بنایا ہے۔ آپ کو معلوم نہیں کہ اس نے اس کے لیے راتوں کی نیند اور دن کا چین گنوایا ۔ یہ کوئی معمولی عورت نہیں کرسکتی ۔ کشمیر میں اتنے نامور ڈاکٹر تھے، اکثر و بیشتر یورپ یا خلیجی ممالک بھاگ گئے ۔ مجھے اس دیوی پر فخر ہے جس نے اپنی یتیمی بھول کر اپنی قوم کی خدمت کرنا اپنا فرض سمجھ لیا۔''

''ٹھیک ہے، اب تم چلے جاؤ۔ لیکن خیال رہے کہ ہمارے لوگ تمھارے پیچھے سائے کی طرح پڑے ہوئے ہیں۔''

گوتم سہما سہما اپنے گھر پہنچ گیا۔ کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا ماجرا ہے۔اس کے پیچھے کس کا ہاتھ ہوسکتا ہے؟ اگر ڈاکٹر کے پھیرے بھائی کا ہے تو اس کو اس سے کیا فائدہ ملے گا؟ اب

تو دونوں کے راستے الگ ہو چکے ہیں۔ اس کی شادی بھی ہو چکی ہے۔ گوتم سپر و سوچنے لگا۔ مگر کہیں کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔ وہ رات بھر کروٹیں بدلتا رہا۔

(۳۵)

ساحرہ اب زیادہ تر اپنے میکے ہی میں رہتی تھی۔ سسرال میں کبھی کبھار برقع پہن کر جاتی اور دن بھر رہ کر واپس چلی آتی۔ اسے اپنی سسرال کا حبس زدہ ماحول بالکل پسند نہیں تھا۔ ہر طرف پولیس اور جاسوسوں کا پہرہ لگا رہتا تھا۔ کون آیا اور کون گیا اس کی انھیں پوری خبر رہتی تھی۔ بہت عرصے کے بعد اس کے میکے میں خالد رات کی گہری تاریکی میں نمودار ہوا۔ اس کے ساتھ دو اور ساتھی تھے۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ ساحرہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ صدر دروازے پر جا کر پوچھا۔ ''کون''

''آہستہ سے بولو۔ میں... خالد۔''

ساحرہ نے بغیر شور وغل کے دروازہ کھول دیا۔ خالد اور اس کے دونوں ساتھی، ہاتھوں میں اے کے-۴۷ تھامے اندر آ گئے اور سامنے والے کمرے میں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ساحرہ نے کمرے کی بتی جلانی چاہی مگر خالد نے اسے منع کر دیا اور کوئی لالٹین جلانے کو کہا تا کہ باہر کسی کو شک نہ ہو۔ خالد نے ساحرہ کو چائے بنانے کو کہہ دیا۔ وہ اندر کچن میں چلی گئی مگر اس کا دھیان ان کی گفتگو سننے کی طرف ہی تھا۔

اسی دوران یاسر نے خالد عرف ابو سلمان کو مخاطب ہو کر کہا۔ ''آپ نے جیسے حکم دیا تھا، ہم نے ویسے ہی تفتیش کی۔ ڈاکٹر صاحبہ اپنے گھر میں اکیلی رہتی ہے۔ اس کی ایک نوکرانی بھی وہیں رہتی ہے۔ کشتواڑ کی کوئی بیوہ ہے جو پہلے لالہ دین دیال کے ہاں کام کرتی تھی۔ جس زمین پر اس نے اسپتال کھڑا کیا ہے وہ اسی ہندو کھتری لالہ دین دیال کی زمین تھی۔ سنا ہے کہ اس نے ڈاکٹر صاحبہ کی نیک نیتی اور غریب نوازی کو دیکھ کر وہ زمین اس کو تحفتاً دی ہے۔ آخری

دنوں میں ڈاکٹر صاحبہ لالہ کی دیکھ بھال کرتی تھی کیونکہ اس کا یہاں کوئی رشتہ دار نہیں تھا۔اب تو وہ مر چکا ہے۔

رہا اس ہندو کا سوال جو اس کے اسپتال میں کام کرتا ہے، اس کا نام گوتم سپرو ہے۔ وہ پہلے کسی سرکاری اسکول میں ماسٹر تھا۔ ہم نے اسے اغوا کیا تھا مگر وہ کہتا ہے کہ نہ تو اس کا ڈاکٹر صاحبہ سے کوئی رشتہ ہے اور نہ وہ اس کے یہاں رہتا ہے۔ البتہ وہ بچپن میں اس کا استاد تھا اور اسی وجہ سے اس کی فیملی کے ساتھ اچھے تعلقات تھے۔ چونکہ ڈاکٹر کے والدین بم بلاسٹ میں مارے گئے اور ڈاکٹر صاحبہ کا یہاں کوئی اپنا نہیں تھا، اس لیے وہ اس کو ڈھارس دیتا رہا اور اس کا حوصلہ بڑھاتا رہا۔ بقول گوتم سپرو وہ انسانیت کے لیے بہت بڑا کام کر رہی ہے۔ڈاکٹر صاحبہ نے شادی کیوں نہیں کی، اس بارے میں اسے کچھ بھی نہیں معلوم۔ اپنے بارے میں کہتا ہے کہ اسے اپنی دھرتی سے لگاؤ ہے اور ماں کے مرنے کے بعد اس نے اپنی شادی کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں۔"

ابوسلمان نے یہ سب باتیں سن لیں اور ان پر غور بھی کرتا رہا۔ پوچھا۔"کیا وہ اس کے گھر آتا جاتا ہے؟ اگر ہاں تو کس وقت؟"

یاسر نے جواب دیا۔"ہم نے تو اسپتال اور گھر پر پوری نظر رکھی ہے۔ وہ اسپتال تو ہر روز آتا ہے اور کبھی کبھار وہاں ڈاکٹر صاحبہ سے ملتا ہے مگر اس کے گھر میں کبھی نہیں دیکھا گیا۔ ہم نے ان کے ٹیلی فونوں پر بھی پہرہ لگا رکھا ہے مگر دونوں کی آپس میں کبھی کوئی گفتگو نہیں ہوتی۔ ہاں جتنا ہمیں اپنے ذرائع سے معلوم ہوا ہے ان دونوں کے بیچ ناجائز تعلقات نہیں ہے۔ دونوں کو خدمت خلق کا جنون سوار ہو چکا ہے اور وہ اپنے نصب العین کے لیے زندگی داؤ پر لگائے ہوئے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ پنڈت وادی چھوڑ کر نہیں جا رہا ہے۔"

دریں اثنا ساحرہ نمکین چائے سے بھرا سماوار اٹھا کر لے آئی اور ان کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ ساتھ ہی تین پیالے اور پلیٹ میں باقرخانیاں رکھ کر چل دی۔ سماوار میں چائے ابل رہی تھی

اور اس کی ٹونٹی سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ابو سلمان نے جلدی سے سماوار سے پیالوں میں چائے انڈیل دی اور دونوں رفیقوں کے سامنے رکھ دی۔ پھر چائے کے گھونٹ پیتے ہوئے گویا ہوا۔

''اچھا تو یہ بات ہے۔ مجھے تو ان دونوں پر شک ہو رہا تھا کہ شاید ان کے بیچ ناجائز تعلقات ہیں۔ خیر اب تم لوگوں نے چھان بین کی ہے اس لیے یقین کرنا پڑے گا۔تاہم ان دونوں پر لگاتار نظر رکھنا ضروری ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ کشمیری مسلمانوں کے بیچ ایسے کافر پھرتے رہیں اور ہندوستانی فوج کے لیے مخبری کرتے رہیں۔ ہماری تحریک اسلامی نظام قائم کرنے کے لیے وقف ہے اور اس میں کسی کافر کا ہونا بہت ہی خطرناک ہے۔ورنہ کیا وجہ ہے کہ سب ہندو کشمیر چھوڑ کر چلے گئے مگر ایک اکیلا یہی کافر یہاں جما رہا۔یا تو اس خبیث کو ڈر نہیں لگتا ہے یا پھر یہ ڈاکٹر مہک سے دور نہیں جاسکتا ہے؟''

''نہیں جناب، اس بارے میں بھی ہم نے بہت تفتیش کی۔اس کا ہندوستانی فوج یا پولیس سے دور دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں ہے۔نہ اس کے دوست احباب ہیں اور نہ ہی وہ اسپتال کے سوا اپنے گھر سے کہیں اور جاتا ہے۔ہاں پاس پڑوس کے مسلمان بچوں کو میتھس ٹیوشن پڑھاتا ہے۔ہم نے اسے دھمکی بھی دی ہے کہ وہ آئندہ ڈاکٹر صاحبہ سے نہ ملا کرے۔''

''بہت اچھا یا سر بھائی، آگے بھی ان دونوں کی سرگرمیوں پر کڑی نگاہ رکھنا پڑے گی۔کہیں کوئی غفلت ہوئی تو ہمیں لینے کے دینے پڑیں گے۔اس لڑکی کا والد ریاستی سرکار کا افسر رہا تھا اور یہ لڑکی زیادہ تر دہلی میں رہی ہے، اس لیے ہوسکتا ہے کہ یہ ان کے لیے کام کرتی ہو۔ ورنہ اتنی تعلیم یافتہ ڈاکٹر وہاں سے آکر ان حالات میں کشمیر میں اسپتال کیوں بناتی۔اور پھر اتنا بڑا اسپتال! اس کے لیے سرمایہ کہاں سے آیا؟ مجھے تو شک ہو رہا ہے کہ اس کو مخبری کا کام کرنے کے لیے ہندوستانی سرکار نے یہاں رکھا ہے اور سرکار ہی اس اسپتال میں سرمایہ کاری کر رہی ہے۔''

''آپ کا شک صحیح ہوسکتا ہے۔ہم رات دن چوکس رہیں گے،آپ اطمینان رکھیں۔

ہمارے رہتے آپ پر یا تنظیم پر کوئی انگلی نہیں اٹھے گی۔ اب جانے کی اجازت دیں۔''

یاسر اور اس کے ساتھی نے اپنی راہ لی۔ تھوڑے وقفے کے بعد ابوسلمان اندر جا کر بستر پر لیٹ گیا۔

اُدھر رسوئی میں ساحرہ نے ان کی باتیں سننے کی کوشش کی۔ کچھ سن لیں اور کچھ سن نہیں پائی۔ وہ بوکھلا گئی۔ جی میں آئی کہ اسی وقت بچے کو لے کر نزدیکی گھاٹ سے دریا میں چھلانگ لگا دے۔ سوچنے لگی کاش وہ بھی کسی امیر کی بیٹی ہوتی تو آج یہ دن دیکھنے کو نہ ملتا۔ ساحرہ بچے کے پاس دوسرے کمرے میں سونے کے لیے چلی گئی۔ اس کی آنکھوں سے برسات برس رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ انسان کتنا نیچ اور کمینہ ہوسکتا ہے۔ یہ بندہ جو اسلامی حکومت اور شریعت کی باتیں کرتا ہے کتنے غیر اسلامی فعل کرتا رہا ہے۔ اسے نہ اللہ کا خوف ہے اور نہ روز محشر کا۔ اس تنظیم کے مجاہدوں کو وہ اپنی ذاتی نفرتوں کا حساب چکانے کے لیے استعمال کر رہا ہے اور وہ ہیں کہ انھیں انسان اور انسان میں فرق کرنا نہیں آتا ہے۔ ایک جانب یہ ہے جو انسانیت پر ایک بدنما داغ ہے، جو اپنی اہانت کا بدلہ اتنے برسوں کے بعد لینا چاہتا ہے اور دوسری جانب وہ ہے جو انسانی بقا کے لیے رات دن ایک کرتی ہے، جو بے شمار زندگیوں کو موت سے چھین کر زندگی بخشتی ہے، جس نے مجھ جیسی بے سہارا بانجھ عورت کی گود میں ایک ننھا منا بچہ ڈال کر دنیا کے ظلم وستم سے بچایا۔

وہ چوراہے پر جا کر زور زور سے چلانا چاہتی تھی اور ان تنظیموں کے مجاہدوں کو باور کرانا چاہتی تھی کہ اللہ تعالیٰ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ اس کے سامنے کوئی اپنا اور کوئی پرایا نہیں ہے۔ وہ منصف ہے، رحیم ہے اور کریم ہے۔ وہ ان بندوق برداروں کو، جو نیک بندوں کو مارتے ہیں یا ان کو عذاب پہنچاتے ہیں، کبھی معاف نہیں کرے گا۔ جنت کے دروازے تو ڈاکٹر مہک ملِک جیسی خواتین کے لیے کھلیں گے جو انسانیت کے لیے خون پسینہ ایک کرتی ہیں نہ کہ ان جیسے غیر مہذب جاہلوں کے لیے جو انسانیت کا قلع قمع کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

ان ہی خیالوں میں مستغرق ساحرہ کی آنکھ لگ گئی اور وہ حقیقت سے خوابوں کی دنیا میں

چلی گئی۔ وہاں اس نے ڈاکٹر مہک کو شہزادی کے روپ میں ایک تخت پر براجمان دیکھا۔ کئی خوبصورت خادمائیں اس کی خدمت میں مصروف تھیں۔ تاجور مہک کی نظر جونہی سامنے سائلوں پر پڑی تو اس نے ساحرہ کو دیکھ لیا، وہ حیران ہوگئی اور زور سے پکارا۔ ''ساحرہ، تم وہاں کیا کر رہی ہو۔ تم تو میری اپنی ہو، تم میرے پاس آؤ اور یہاں بیٹھو۔ دیکھو یہ جگہ کتنی خوبصورت ہے، یہاں کے لوگ صاف وشفاف ہیں، دل کے سچّے اور ایمان دار ہیں، نہ کسی کے دل میں بغض ہے اور نہ کینہ توزی، سب ایک دوسرے کے ہمدرد ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہ جگہ جنت الفردوس بن جائے۔ یہ تمھاری اُس دنیا سے بالکل مختلف ہے۔''

ساحرہ سہمی سہمی آگے بڑھی۔ اس نے اپنے دائیں بائیں یہ دیکھنے کے لیے نظر ڈالی کہ کہیں اس کا خاوند یا ساس تو نہیں موجود ہیں۔ جب وہ کہیں نظر نہیں آئے تو بڑے اطمینان سے مہک کے پاس پہنچ گئی۔ پھر کہنے لگی۔ ''آپا، اُس دنیا میں لوگ تمھاری قدر نہیں کرتے جبکہ اِس دنیا نے تمھارے اصلی جوہر کو پہچان لیا ہے۔ کتنی قدر کر رہے ہیں یہ لوگ تمھاری۔ تم یہاں بھی ایک ہسپتال کھول دو اور غریب لاچار لوگوں کی دیکھ بھال کرلو۔''

''ہاہاہا، تمھیں کیا لگتا ہے کہ میں یہاں نٹھلی بیٹھی ہوں۔ ساحرہ، میں نے یہاں ایک نہیں کئی اسپتال کھولے ہیں جہاں لوگوں کا مفت علاج ہوتا ہے۔ یہاں کے لوگ عجیب ہیں۔ جن کے پاس دولت ہے وہ بغیر کسی کے کہے وہاں اس ڈونیشن بکس میں خود ہی ذکواۃ جمع کرتے ہیں۔ ہمارے کہنے کی ضرورت نہیں پڑتی ہے۔ یہاں مرد عورتیں سب تعلیم یافتہ ہیں اور کسی کو کسی پر اجارہ داری نہیں ہے۔''

''آپا، تم تو بہت خوش قسمت ہو۔ یہاں لوگ تمھاری اتنی عزت کرتے ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ میں بھی یہیں تمھارے ساتھ رہوں، ان بے رحم اور سفاک لوگوں سے دور، جنھوں نے اپنے ہی بھائی بندوؤں کا جینا حرام کر دیا ہے۔''

دفعتاً ساحرہ کو ایسا لگا کہ پولیس اس کے گھر کا صدر دروازہ توڑ کر اندر آچکی ہے اور

ابوسلمان کو ڈھونڈ رہی ہے۔اسی جھٹکے کے ساتھ اس کا خواب ٹوٹ گیا اور وہ جاگ گئی۔دائیں بائیں دیکھا وہاں نہ ڈاکٹر مہک تھی اور نہ ہی وہ دنیا جہاں اس نے پناہ لی تھی۔وہ اپنے آپ کے ساتھ کافی دیر تک ہنستی رہی اور پھر اٹھ کر واش روم چلی گئی۔واپس آ کر اس نے پانی پی لیا اور دوبارہ لیٹ گئی۔

(۳۶)

ڈاکٹر مہک ملک کچھ دیر پہلے ہی گھر سے لنچ کھا کر اسپتال لوٹ آئی تھی۔یکا یک باہر اسپتال کے احاطے میں شور سنائی دیا۔وہ جلدی سے کمرے سے نکل کر اسپتال کے گراونڈ میں پہنچ گئی۔وہاں اسٹریچر پر کئی زخمیوں کو ایمر جنسی میں لایا جارہا تھا۔اسپتال کا عملہ ان کی مدد کرنے میں لگا ہوا تھا۔اسپتال سے ایک ڈیڑھ کلومیٹر کی دوری پر کچھ ملی ٹنٹوں نے سی آر پی ایف بنکر پر طاقت ور ہینڈ گرنیڈ پھینکے تھے جس کی وجہ سے کئی سپاہی زخمی ہوئے تھے۔ملی ٹنٹ بھیڑ میں گھس کر بھاگنے کی کوشش کر رہے تھے۔بھیڑ میں نہ جانے کہاں سے بہت سارے بچے اور نوجوان نمودار ہوئے اور انھوں نے سیکورٹی فورسز پر پتھراؤ شروع کر دیا۔بہت دیر تک سپاہیوں نے حفاظتی جالی سے ان کا پتھراؤ روکنے کی کوشش کی مگر جب ہنگامہ تھما نہیں تو ان پر آنسو گیس چھوڑ دی۔اس کا بھی کوئی اثر نظر نہیں آیا۔سنگ باری کرنے والے اطفال پتھر برساتے رہے۔دوسری جانب سیکورٹی فورسز نے ملی ٹنٹوں کا تعاقب کر کے اندھا دھند فائرنگ کی جس کی وجہ سے نہ صرف کئی معصوم شہری فائرنگ کی زد میں آ کر مارے گئے یا پھر زخمی ہوئے۔سارے ایریا میں کہرام مچ گیا۔اور کچھ لوگوں نے زخمیوں کو اسپتال پہنچانے کے لیے کمر کس لی۔ایمر جنسی میں مختلف ڈاکٹر اور نرسنگ اسٹاف ڈاکٹر مہک ملک کی نگرانی میں ان زخمیوں کی مرہم پٹی کرنے میں جٹ گئے۔جن کو معمولی زخم آئے تھے ان کو مرحم پٹی کر کے واپس گھر بھیج دیا گیا۔اس کے برعکس جو لوگ بری طرح

زخمی ہوئے تھے یا جن کے جسم میں گولیاں پیوست ہو چکی تھیں، ان کو اسپتال میں بھرتی کر دیا گیا اور ان کی تیمارداری کا انتظام کیا گیا۔ کچھ دیر میں پولیس آگئی اور انھوں نے نہ صرف اسپتال کے اسٹاف سے پوچھ تاچھ کی بلکہ مریضوں سے بھی تفتیش کی۔ کہیں کوئی سراغ نہ ملا، اس لیے واپس چلے گئے۔ تین چار روز تک مریضوں کی دیکھ بھال ہوتی رہی اور وہ ایک ایک کر کے ڈسچارج کیے گئے۔

ڈسچارج سے پہلے زخمیوں میں سے ایک مریض نے ڈاکٹر مہک ملک سے ملاقات کی۔

''ڈاکٹر صاحبہ، آپ نے شاید مجھے پہچانا نہیں؟''

''نہیں، میں چار روز قبل ہی تم سے پہلی بار ملی ہوں جب تمھیں زخمی حالت میں یہاں لایا گیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ ہم اس سے پہلے بھی کہیں ملے تھے۔'' ڈاکٹر مہک ملک نے عمداً ناواقفیت کا اظہار کیا۔

''ڈاکٹر صاحبہ، میرا نام مجید وانی ہے۔ میں آپ سے پہلے بھی ایک بار مل چکا ہوں۔ اس روز ہم دو مجاہد تھے۔ کچھ یاد آیا آپ کو۔''

''ارے بھائی، یہاں میرے پاس دن میں بیسیوں مریض آتے ہیں، کس کس کا چہرہ یاد رکھوں۔''

''میں ان دو مجاہدوں کی بات کر رہا ہوں جو آپ کے اسپتال میں پناہ لینے کے لیے آئے تھے اور آپ نے منع کیا تھا۔ ان میں سے ایک مجاہد نے آپ کو دھمکی بھی دی تھی۔''

''بھائی، مجاہد بھی کئی اسپتال میں آتے رہتے ہیں۔ اسپتال میں کسی کو آنے کی مناہی تھوڑے ہی ہے۔ جس مجاہد کا کام نہیں ہو پاتا وہ دھمکی دے کر چلا جاتا ہے۔ کسی کو چندے کی ضرورت ہوتی ہے، سو اس کو مناسب چندہ دے دیتے ہیں۔ مگر جس واقعے کا تم ذکر کر رہے ہو نہ جانے وہ میرے دماغ سے کیوں محو ہو گیا ہے۔ ایک بات اور اگر تم مجاہد ہو تو پھر پولیس نے تمھیں کیوں نہیں پہچانا، انھوں نے تو ایک ایک بندے سے تحقیقات کی؟''

''ہاں میں ڈر رہا تھا کہ کہیں میری شناخت نہ ہو جائے، پھر تو وہ پکڑ کر لے جاتے اور عقوبت خانے میں میرا زدوکوب کرتے۔''

''چلو اچھا ہی ہوا کہ تم بچ نکلے۔ خیر بتاؤ اب کیسا محسوس ہو رہا ہے۔ تمھیں تو دو گولیاں لگی تھیں۔''

''ڈاکٹر صاحبہ، اب میں ٹھیک ہوں۔ آپ نے میرا اتنا خیال رکھا کہ میں زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔ سچ پوچھو تو آپ کو دیکھ کر مجھے اپنی بڑی بہن یاد آئی۔ وہ بے چاری حاملہ تھی اور موجودہ حالات میں وقت پر علاج نہ ملنے پر اس کا انتقال ہو گیا۔ کاش آپ جیسی کوئی ہمدرد ڈاکٹر مل جاتی شاید وہ بچ جاتی۔''

''مجھے بھی اپنی بڑی بہن ہی سمجھو۔ رشتہ صرف خون کا ہی نہیں ہوتا ہے۔''

''آپ کی بات صحیح ہے۔ انسان کا انسان سے رشتہ سب سے پر اعتماد رشتہ ہوتا ہے۔ آپا، ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں اگر اجازت ہو تو۔''

''کہو، اس میں اجازت کی کیا بات ہے۔''

''آپا، آپ کو خالد بٹ عرف ابو سلمان سے کیا عناد ہے؟ وہ ہاتھ دھو کر آپ کے پیچھے کیوں پڑا ہے؟ آپ کو جو دھمکیاں دی جاتی ہیں، وہ اسی کے کہنے پر دی جاتی ہیں۔ کہیں وہ.... آپ کی جائیداد وغیرہ تو نہیں ہڑپنا چاہتا ہے؟ ہمیں تو یہ بتایا گیا کہ آپ اسلام کے خلاف ہیں اور کافروں سے آپ کا رابطہ ہے۔ یہاں تک کہ کسی پنڈت سے آپ کے ناجائز تعلقات ہیں۔ مگر یہاں آکر میں نے آپ کو قریب سے دیکھا، آپ کے بارے میں آپ کے اسٹاف سے پوچھا، وہ سب آپ کی تعریفیں کر رہے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ آپ غریب پرور اور فلاح کار ہیں، ایک سچے مسلمان کی طرح آپ بنی نوع انسان سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ یہاں آپ کو دیکھ کر اور آپ کے کام کاج کو دیکھ کر میری آنکھیں کھل گئیں۔ اللہ آپ کی عمر دراز کرے اور آپ اپنے مشن میں کامیاب ہوں۔''

''شکریہ بھائی۔ تم جیسے لوگوں کی دعائیں میرے ساتھ ہوں تو میں ضرور اپنے مقصد میں کامیاب رہوں گی۔''

اچھا آپا، مجھے اجازت دو، اللہ حافظ۔''

(۴۷)

اسپتال دھیرے دھیرے واپس اپنی ڈگر پر آ گیا۔ سیکورٹی فورسز سے مڈبھیڑ میں جو زخمی ہوئے تھے وہ سب خارج ہو گئے۔ مگر ڈاکٹر مہک اس واقعے کے بعد بہت پریشان رہنے لگی۔ ایک اکیلی جان اور اتنے سارے دشمن...! ڈنر کرنے کے بعد وہ بہت دیر تک اس بات پر فکر و تردّد کرنے لگی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس نے خالد یا اس کی ماں کا کیا بگاڑا تھا کہ وہ ہاتھ دھو کے اس کے پیچھے پڑے ہیں۔ حیرت تو اس بات کی تھی کہ ایک سگی بہن اپنے بھائی کا گھر اجاڑنے پر تُلی ہوئی تھی۔ خون کا رشتہ اتنا خبیث اور بد باطن ہوگا وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

سوچتے سوچتے ڈاکٹر مہک ملک نہ جانے کس اتھاہ سمندر میں غوطے لگانے لگی۔ وادی کے موجودہ حالات کو دیکھ کر انسان کو انفرادی نفرتیں بھُلا کر ساری قوم کے بارے میں فکر کرنی چاہیے اور جہاں تک ہو سکے ان کی امداد کرنی چاہیے۔ اس کے برعکس یہ لوگ اپنی ذاتی دشمنی کو لے کر بیٹھے ہیں اور مجھے مارنے کی سبیلیں کر رہے ہیں۔ وہ بھول رہے ہیں کہ میرے مر جانے سے عام لوگوں کو کتنا زک پہنچے گا۔ یہ اسپتال قوم کی ملکیت ہے اور اس کا وجود کشمیر کی بدنصیب عوام کے لیے ناگزیر ہے۔ اگر یہ لوگ مجھے مارنے میں کامیاب ہو گئے تو اس ہسپتال کا کیا ہوگا؟ یہ اینٹ پتھر کی عمارت تو تاش کے پتوں کی طرح گر جائے گی۔ اس کی دیکھ بھال کون کرے گا؟ خالد اور اس کی ماں سوچتے ہوں گے کہ میری وفات کے بعد وہ میری جائیداد کے

مالک بن جائیں گے کیونکہ میرا ان کے بغیر کوئی قریبی رشتے دار نہیں ہے۔ کس زعم میں جی رہے ہیں۔ وہ لچا لفنگا اسپتال کیا چلائے گا۔ یہ کوئی قہوہ خانہ یا جوے کا اڈّہ تو ہے نہیں کہ کوئی بھی ایرا غیرا چلا سکے گا۔ اسپتال چلانے کے لیے مناسب تعلیم، انصرامی قابلیت، دردمندی اور خلوص ہونا چاہیے۔ خالد تو اپنے باپ کی طرح نیم خواندہ جنگلات کا کنٹریکٹر ہے جو عمر بھر بیش بہا جنگلات کاٹ کاٹ کر وادی کو ننگا کرتا رہا ہے۔ ایسے ہی بدخواہوں نے نہ صرف وادی کا ماحول بگاڑ دیا بلکہ یہاں کا موسم بھی بدل ڈالا ہے۔ کبھی جنگل نذر آتش ہوتے ہیں، کبھی سوکھا پڑ جاتا ہے، کبھی سیلاب آجاتے ہیں اور کبھی وبا پھیل جاتی ہے۔ کچھ برس پہلے کتنا خوفناک اور تباہ کن سیلاب آیا تھا جس نے بیسیوں جانیں لیں اور کروڑوں کی مالیت کو نقصان پہنچایا۔ مگر انسانیت کے ان دشمنوں کو کون سمجھائے کہ تم لوگ اپنے ذاتی مفاد کے لیے کیسے آنے والی نسلوں کے لیے کشمیر کا ماحول بگاڑ کر رہے ہو۔

اور پھر فرض کرلیں کہ ماں بیٹے نے میری جائیداد پر قبضہ جما بھی لیا، جمیلہ بوا کو کون سمجھائے کہ اس کا اکلوتا بیٹا ادھار کی زندگی جی رہا ہے۔ اس کے نام کا کارتوس تو فوجیوں نے اپنی بندوق میں کب کا بھر دیا ہے۔ نہ جانے کب اور کس موڑ پر وہ اس کے سینے کے آر پار ہوگا۔ پھر بوا باقی ماندہ زندگی میں اس ساری جائیداد کی تسبیح بنا کر اسے پھیرتی رہے گی۔

دفعتاً اس کو ساحرہ کی یاد آئی۔ سوچنے لگی کہ میں نے تو خالد کے گھر کو ویران ہونے سے بچایا، اس کی بیوی، جس کو ماں بیٹا بانجھ سمجھ رہے تھے، کا علاج کیا اور اس گھر کو ایک آفتاب سا بیٹا دیا۔ کم سے کم اتنا تو سوچ لینا چاہیے۔ ان کو تو میرا شکر گزار ہونا چاہیے۔ مگر نہیں، وہ تو سنگ دل، وحشی درندے ہیں جو بغض کے سمندر میں ڈوب کر کسی بھی سطح تک گر سکتے ہیں۔ نہ جانے بے چاری ساحرہ کا کیا حال ہوگا؟ وہ کہتی تو ہے نہیں مگر اس کی گفتگو سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنی سسرال میں بالکل خوش نہیں ہے۔ غریب اور ان پڑھ ہونے کی وجہ سے وہ کچھ بھی نہیں کرپاتی۔ بے چاری بندھوا مزدور کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ اس کا شوہر کہاں ہے... کب آئے گا... آئے گا بھی یا نہیں...

کچھ بھی معلوم نہیں اس بیچاری کو... پھر بھی جئے جارہی ہے۔ کسی کو اس کی چنتا نہیں۔ اس کی ساس تو ڈائن ہے، وہ صرف تخریب کے بارے میں سوچتی ہے، تعمیر تو اس کے بس کی بات نہیں۔ لیکن اس کو کیا معلوم کہ وہ جن شعلوں کو ہوا دے رہی ہے وہی ایک روز اس کے پورے گھر کو بسم کرلیں گے۔ میرے نیک ابو کی چڑیل بہن...! خدا جانے کس مٹی کی بنی ہوئی ہے۔ میرے ابو تو قبر میں کروٹیں لے رہے ہوں گے کہ یہ بلا کیسے ان کے خاندان میں پیدا ہوگئی؟

ڈاکٹر مہک کو اپنی امی اور ابو کی بہت یاد آ گئی۔ وہ خود کو بدقسمت سمجھ رہی تھی کہ اس کے والدین نے اس کے لیے اتنی قربانیاں دیں مگر اس کی زندگی کی بہار کی جھلک بھی نہ دیکھ پائے۔ انھوں نے کسی کا کچھ بھی نہیں بگاڑا تھا۔ والد بہت ہی ایماندار اور ہمدرد افسر تھے۔ صوم وصلواۃ کے پابند تھے۔ غریبوں کی مدد کرتے تھے۔ انھوں نے کبھی کسی کی بددعا نہ لی۔ سب کا واجبی کام کر لیتے تھے اور کبھی کسی سے رشوت نہیں لی۔ ان کی روشن ذہنی کی وجہ سے میں ڈاکٹر بن سکی ورنہ اس مشٹنڈے خالد کی باندی بنی ہوتی۔ ماں بھی بہت ہی محنتی اور پاک باطن تھی۔ نہ کسی سے کوئی جھگڑا اور نہ ہی کسی سے کوئی عداوت۔ میں نے اسے کبھی جھوٹ بولتے نہیں دیکھا۔ سچ تو یہ ہے کہ ایسے والدین ہزاروں میں ایک کے نصیب میں ہوتے ہیں۔ مگر کیا کروں، ان کا سایہ پہلے ہی اٹھ گیا اور میں اکیلی رہ گئی۔

اس کی آنکھیں نم ہوتی جارہی تھیں۔ آج کچھ ڈر، کچھ خوف اور کچھ اکیلا پن سا محسوس ہو رہا تھا۔ زندگی کی بے ثباتی نے اسے مایوس و بے بس کر دیا تھا۔ دنیا میں ایک ہی سہارا بچا ہوا تھا، وہ تھا گوتم سپرو کا مگر اس کو اپنے پاس بلانا ناممکن تھا۔ اس کو وہ دن یاد آیا جب بی اے میں پڑھ رہا ایک شرمیلا نوجوان اس کو پڑھانے کے لیے آ گیا اور پھر اپنے آداب واخلاق کے سبب گھر کا فرد بن کر رہ گیا۔ اس بے چارے نے تو کبھی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا مگر نہ جانے اس کی شخصیت میں کیسی مقناطیسی کشش تھی کہ میں جستہ جستہ اس کی جانب کھنچتی چلی گئی۔ پھر بھی میں اسے اپنے دل کی بات نہیں کہہ پائی جب تک میں اس سے دور چلی گئی۔ دہلی میں میڈیکل کالج میں داخلہ مل گیا

اور تب کہیں خیال آیا کہ مجھے اپنی محبت کا اعتراف کرنا چاہیے۔ ڈرتے ڈرتے اس کو ایک پیار بھرا خط پوسٹ کیا۔ اس نے بہت سمئے تک مجھے ٹالنے کی کوشش کی مگر میں تو دیوانی ہو چکی تھی اس لیے میں نے اس کا دامن نہیں چھوڑا۔

آخر کار اس نے مجھے اپنا لیا مگر اس بات سے خبردار بھی کیا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے دوست تو بن سکتے ہیں مگر ہم سفر نہیں بن سکتے کیونکہ ہمارے درمیان مذہب کی دیوار ہے اور اس سے توڑنا شاید ہمارے لیے ممکن نہ ہوگا۔ میں نے اس دیوار کو توڑنے کے کئی منصوبے بنائے مگر ناکام رہی۔ عین وقت پر کوئی نہ کوئی مشکل درپیش آتی رہی۔ کبھی میرے والدین اور کبھی اس کی بیوہ ماں۔ تاہم دونوں ایک دوسرے کو اس قدر چاہنے لگے کہ اب ہم کو کوئی جدا نہیں کر سکتا۔

مہک کو گوتم کی ہر ادا یاد آنے لگی۔ وہ معصوم سا چہرہ، گھنگھریالے بال، غلافی آنکھیں اور مخروطی انگلیاں۔ کاغذ پر اس کی لکھائی تو دیکھنے کی چیز ہوتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ چھاپہ خانہ میں پرنٹ ہو کر آئی ہے۔ اور پھر اس کی یادداشت بھی تو غضب کی تھی۔ اس کا میتھس سکھانے کا ڈھنگ نرالا تھا ورنہ میرے جیسے طالب علم کو میتھس کے نام سے چڑ تھی۔ شاید اگر گوتم نہ ہوتا تو میرے لیے میڈیکل سیٹ حاصل کرنا مشکل ہو جاتا۔ اس بے چارے نے تو رات دن ایک کر کے مجھے اس قابل بنایا کہ میں ڈاکٹر بنوں۔

نہ جانے اس وقت گوتم کہاں ہوگا؟ سو رہا ہوگا یا جاگ رہا ہوگا۔ بہت اکیلا محسوس کر رہا ہوگا۔ بے چارہ میری وجہ سے اس مصیبت میں پھنس گیا۔ اس نے سوچا کہ گوتم کو ٹیلی فون کر لوں لیکن پھر خیال آیا کہ دونوں کے ٹیلی فونوں پر پہرے بٹھائے گئے ہیں، اس لیے اپنا ارادہ بدل دیا اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔ نیند تو خیر کوسوں دور تھی اور وہ رات بھر کروٹیں بدلتی رہ گئی۔

(۳۸)

مجید وانی کے ساتھ اسپتال میں ہوئی گفتگو نے ڈاکٹر مہک ملک کو نہ صرف خوفزدہ کر دیا بلکہ چوکنا بھی۔ وہ سر پر لٹک رہی اس تلوار سے اکیلی نہیں جوجھ پا رہی تھی۔ بہت سوچ بچار کر کے آخر کار اس نے گوتم سپرو کو اپنے آفس کمرے میں بلوایا اور اسپتال کے انتظام اور اکاونٹس کے بارے میں پوچھ لیا۔ اس روز شہر میں کرفیو کی وجہ سے اسپتال میں زیادہ بھیڑ نہیں تھی۔ حالانکہ گوتم بالراست اسپتال کا حساب کتاب اب نہیں رکھتا تھا تاہم وہ وقتاً فوقتاً اکاونٹس شعبے سے اس کی خبر لیتا رہتا تھا۔ اس نے دونوں موضوعات پر ڈاکٹر مہک کو تفصیل پیش کر دی۔ دریں اثنا ڈاکٹر مہک ملک نے کینٹین سے چائے منگوائی اور دونوں اس کی چسکیاں لینے لگے۔ ڈاکٹر مہک اٹھ کھڑی ہوئی اور دروازے کے باہر جھانک کر یہ تسلی کی کہ کوئی کمرے کے باہر ان کی باتیں سن تو نہیں رہا ہے۔ اس کے بعد وہ مسکراتے ہوئے دھیمے لہجے میں گوتم سے مخاطب ہوئی۔ ”گوتم تم تو اب عید کے چاند ہو گئے ہو۔“

”تم کہہ دو تو ہر روز ملنے آیا کروں گا۔ تم ہی نے تو یہ کہہ کر منع کیا ہے کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں اور کچھ لوگ ہمارے اوپر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ ورنہ سچ پوچھو تو جی کرتا ہے کہ تمھارے پاس رہ کر ہی زندگی کے باقی ماندہ دن گزار دوں۔“

”کیا کریں، حالات ہی ایسے ہیں کہ ہم ایک دوسرے سے مل نہیں پاتے۔ تمھیں نہیں معلوم چند افراد ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ وہ جو میرا پھپھیرا بھائی ہے ناں خالد بیگ، جس کا پیغام میرے والدین نے ٹھکرایا تھا، وہ سرحد پار عسکری تربیت لے کر ابو سلمان بن چکا ہے اور اب الجہاد کشمیر کا سرغنہ بنا ہوا ہے۔ وہ مجھ کو ختم کرنے کا بہانہ ڈھونڈ رہا ہے۔“

”ہاں، مجھے معلوم ہے۔ اسی کی ایما پر دو ملی ٹنٹوں نے مجھے اغوا کیا تھا اور مجھ سے بہت

پوچھ گچھ کی تھی مگر میں نے احتیاط سے کام لیا اور ہمارے رشتے کے بارے میں کچھ بھی ظاہر نہ کیا۔ انھوں نے مجھے یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ آئندہ میں تم سے دور ہی رہا کروں۔''

''میں تو حیراں ہوں کہ میں نے ایسا کیا کیا ہے کہ وہ مجھے مارنے کی درپے ہے۔ میں نے تو صرف اس کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کیا تھا۔ وہ بھی اس لیے نہیں کہ مجھے وہ پسند نہیں تھا یا میں اس کو اپنانا نہیں چاہتی تھی بلکہ صرف اس لیے کہ میرا نصب العین ڈاکٹر بننا تھا اور تب تک میں ازدواج میں بندھنا نہیں چاہتی تھی۔ مگر اس کو اور اس کی ماں کو ایسا لگا کہ اگر میں ڈاکٹر بن گئی تو پھر وہ شادی ممکن نہیں ہوگی کیونکہ خالد کو پڑھنے لکھنے سے کوئی رغبت نہیں تھی اور وہ بارہویں بھی بہت مشکل سے پاس کر پایا تھا۔ ماں بیٹا دونوں چاہتے تھے کہ میں اسکول کے بعد مزید تعلیم حاصل نہ کروں اور کولہو کا بیل بن کر باقی ماندہ زندگی بسر کرلوں۔ مگر اللہ مغفرت کرے میرے والدین کو، انھوں نے جمیلہ بوا کی تجویز یکسر ٹھکرائی اور کہا کہ ابھی تو انھوں نے اس بارے میں کچھ بھی نہیں سوچا ہے، میری تعلیم مکمل ہونے کے بعد ہی اس بات کا فیصلہ ہوسکتا ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ خالد کو میرے والدین کی یہ بات ناگوار گزری یا پھر اسے ہتک ہوگیا اور اسی اہانت کا احساس اس کو کسی کروٹ چین نہیں دیتا۔''

''ایسا ہوسکتا ہے۔ کچھ لوگ نرینہ جبریت کے قیدی ہوتے ہیں۔ سوچتے ہیں کہ عورت مرد کے پاؤں کی جوتی ہے۔ وہ کیسے اپنے بارے میں خود فیصلہ لے سکتی ہے۔ شاید یہی بھاونا خالد کے ذہن میں بھی اجاگر ہوئی ہو۔ کیونکہ تم اس کی ممیری بہن ہو، اس لیے شاید اس نے سوچا ہوگا کہ تم پر اس کا پورا پورا حق ہے۔ ممکن ہے کہ وہ انکار سننے کے لیے تیار نہ تھا۔''

''یہ تو اس کا سراسر پاگل پن ہے۔ میں اس کی ممیری بہن ہوں کوئی کنیز تو نہیں۔''

''سو تو ہے۔ میں نے سنا ہے کہ بہت عرصہ پہلے اس کے والد کی زندگی تلپٹ ہوئی تھی اور وہ بھی اپنے والد کی طرح ہی کنٹریکٹر کا کام کر رہا تھا جس میں اسکو بہت خسارہ اٹھانا پڑا۔ شاید وہ تمھاری جائیداد ہڑپنا چاہتا تھا کیونکہ تم اکلوتی اولاد تھی۔ ہوسکتا ہے کہ اب بھی اس کی وہی

خواہش ہو۔''

''اب وہ میری جائیداد کیسے ہڑپ کر سکتا ہے۔ اس کو چاروں طرف پولیس تلاش کر رہی ہے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ ایک نہ ایک دن وہ یا تو پکڑا جائے گا یا پھر مارا جائے گا۔ رہی بات جمیلہ بوا کی وہ تو قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہے۔ دوسری جانب میں نے ساری جائیداد ٹرسٹ کے نام کر دی ہے اور اپنی رجسٹرڈ وصیت میں تحریر کیا ہے کہ میرے بعد اس ٹرسٹ کو سرکاری تحویل میں لیا جائے۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ میری جائیداد کا کوئی بھی حصہ کسی رشتے دار کو نہیں مل سکتا ہے۔''

''اس کے ذہن پر خنّاس سوار ہے اور اب تو اس کے ہاتھ میں بندوق بھی ہے۔ وہ خود کو قانون سے بالاتر سمجھتا ہے۔ اب ایسی ذہنی حالت کا تو کوئی علاج ہو نہیں سکتا۔''

''گوتم، کیا ایسا ممکن نہیں کہ میں کسی سینئر ڈاکٹر کو اسپتال کا منتظم بنا کر خود دہلی چلی جاؤں۔ یہاں جو ہونا ہوگا ہو جانے دو۔ میں سرکار سے بھی اس کو اپنی تحویل میں لینے کے لیے دہلی سے درخواست بھیج دوں گی۔ مجھے جو نقصان ہوگا اس کی مجھے کوئی پرواہ نہیں۔ تم بھی دہلی چلے چلو، کم سے کم جان تو بچ جائے گی۔''

''اب اس موڑ پر پہنچ کر شاید ایسا کرنا بزدلی ہوگی۔ سر او کھلی میں دیا ہے تو موسلوں کا کیا ڈر۔ مہک، ہم نے ایک خواب دیکھا تھا اس کی تعبیر ہمارے سامنے ہے۔ اب آگے جو ہونا ہوگا ہونے دو۔ ہم کیوں اپنے خواب کو ادھورا ہی چھوڑ دیں۔''

''گوتم مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ میرا تو دماغ کام ہی نہیں کر رہا ہے۔''

''اس بات کی طرف تم دھیان ہی مت دو۔ روزمرہ کی طرح زندگی بسر کر لو اور باقی اللہ پر چھوڑ دو۔ ہماری قسمت میں جو لکھا ہوگا سامنے آئے گا۔ خیر اب مجھے یہاں کافی وقت ہو گیا۔ مجھے چلنا چاہیے۔ اپنا خیال رکھنا۔''

''تم بھی اپنا خیال رکھنا۔''

چند روز بعد مجید وانی دوبارہ ڈاکٹر مہک ملِک سے ملنے کے لیے آیا۔ وہ ٹی شرٹ اور جینز پہنے ہوئے تھا، سر پر انگریزی ہیٹ لگی ہوئی تھی اور اس کی آنکھوں پر کالا چشمہ چڑھا ہوا تھا۔ اس پوشاک میں اس کو پہچاننا مشکل تھا۔ جونہی وہ ڈاکٹر کے کمرے میں داخل ہوا تو اس نے اپنا چشمہ اتارا۔ ڈاکٹر مہک نے دیکھتے ہی اس کو پہچان لیا۔

''کہو کیسے آنا ہوا۔ سب خیریت تو ہے نا؟''

''جی ڈاکٹر صاحبہ، سب خیریت ہے۔ اسپتال سے ڈسچارج ہونے کے بعد بہت چاہت تھی کہ آپ سے ملوں اس لیے چلا آیا۔''

''بہت اچھا کیا۔ گھر میں سب ٹھیک ٹھاک ہے؟''

''اللہ جانے۔ مجھے تو وہاں گئے ہوئے بہت روز ہو گئے۔ آج کل سرگرمیاں تیز ہو رہی ہیں اس لیے گھر جانا مشکل ہو رہا ہے۔''

''آپا ایک عرض کرنی تھی آپ سے۔''

''ہاں بلاتوقف کہو۔ یہاں کسی کا کوئی ڈر نہیں ہے۔''

''یہی تو غلط فہمی ہے آپ کو۔''

''بھلا وہ کیسے؟''

''آپا۔ ابوسلمان نے آپ کے اسپتال میں دو چار مخبر رکھے ہوئے ہیں۔ انھیں وہ ماہانہ بھاری رقم دیتا ہے۔ وہ اس کو آپ کی ہر حرکت سے باخبر رکھتے ہیں۔ آپ کے پاس کون آتا ہے اور کون جاتا ہے، آپ کہاں جاتی ہیں اور کس سے ملتی ہیں، یہ سبھی خبریں وہ فوراً موبائیل کے ذریعے پہنچا دیتے ہیں۔''

''اوہ میں سمجھی۔تو اب یہاں بھی اس نے اپنا ناپاک جال پھیلایا ہے۔''

''ہاں آپا، ان کی نظر خصوصاً اس پنڈت پر رہتی ہے جو آپ کے اسپتال میں کام کرتا ہے۔وہ جب بھی آپ کے کمرے میں آتا ہے تو فوراً اس کو خبر کر دی جاتی ہے۔''

''میں سمجھ گئی۔خیر اس اطلاع کے لیے بہت بہت شکریہ۔دیکھو جاتے سمئے احتیاط سے جانا۔کہیں وہی مخبر تمھیں پہچان نہ لیں اور تمھاری شامت آجائے۔''

''میں تو احتیاط کر کے ہی آیا ہوں اور اسی طرح جاؤں گا بھی۔آپ فکر نہ کریں۔خیر اب میں جاتا ہوں۔اللہ حافظ''

''اللہ حافظ''

(۴۰)

آج بُدھ پورنیما ہے۔

آج ہی کے دن گوتم بُدھ کا جنم ہوا تھا۔

گوتم بُدھ...!امن کا پیغامبر....!جس نے اپنا آل وعیال چھوڑ کر جنگل کی راہ لی تاکہ دنیا کی بھیڑ بھاڑ سے الگ ہو کر یہ معلوم کر سکے کہ انسان کے دکھ درد اور زندگی و موت کا کیا راز ہے۔لمبنی کا سدھارتھ گوتم...! کپل وستو کا شہزادہ...!جس نے عیش وعشرت کی زندگی اور دنیا کی تمام آسائشوں کو ترک کر کے عالم کو محبت، اخوت اور عدم تشدد کا پیغام دیا۔

پورنیما کے دن پورا چاند نظر آتا ہے۔پورے چاند کی روشنی میں ہی گوتم بدھ کو انسانی وجود کی سچائی کا گیان حاصل ہوا تھا۔اس نے نہ تو خدا کے ہونے اور نہ ہی اس کے نہ ہونے پر روشنی ڈالی، نہ جنت وجہنم کی بات کی اور نہ تخلیق کائنات پر بحث کی۔اس نے انسان کو نروان حاصل کرنے کے لیے اور دنیا میں امن وشانتی بحال کرنے کے لیے نہ روایتی عبادت کا درس دیا، نہ فاقہ کشی کرنے پر مجبور کیا اور نہ ہی کسی ماورائی طاقت کو خوش کرنے کے لیے کسی جاندار کو قربان کرنے

کے لیے کہا، بلکہ انسان کو چار عظیم سچائیوں سے یوں آشنا کرایا: زندگی دکھ ہی دکھ ہے، دکھ کا سبب خواہشات نفسانی ہیں، خواہشات نفسانی کو قابو کر لیا جائے تو دکھ کم ہو جاتا ہے اور خواہشات نفسانی کا خاتمہ کرنے کے لیے ہشت پہلو راستے پر چلنا ضروری ہے تاکہ انسان تناسخ اَرواح کے چکر سے نجات پائے اور نروان حاصل کرے۔ اس کا ہشت پہلو راستہ یوں ہے: راست فہم وادراک، راست فکر وخیال، راست گفتار، راست عمل، راست ذریعہ معاش، راست جدوجہد، راست چستی وبیداری، راست توجہ ودھیان۔

آج ہی کے روز گوتم سپرو کا بھی جنم ہوا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس کے والد نے اس کے لیے گوتم نام چُنا تھا۔ گوتم سپرو نے بھی زندگی میں کئی قربانیاں دی ہیں۔ اس نے انسانی خدمت کو اپنی زندگی کا نصب العین بنایا اور اس مقصد کو پانے کے لیے اپنی زندگی داؤ پر لگا دی۔ نہ شادی کی اور نہ گھر بسایا۔ نہ اپنی دھرتی کو چھوڑا اور نہ اپنے پیار کو۔ اس نے تخریب کے بدلے تعمیر کو اپنایا اور ایک نوجوان ڈاکٹر کو اپنے خوابوں کی تعبیر پانے کے لیے دامے، درمے، قدمے، سخنے اس کی مدد کی۔ وہ اپنی اس کوشش میں بہت حد تک کامیاب رہا۔

یہ اتفاق کی بات ہے کہ گریگوری کیلنڈر کے مطابق کچھ برس پہلے اسی روز شیریں سپر اسپیشلٹی ہاسپٹل کا سنگ بنیاد بھی ڈالا گیا۔

سنگ بنیاد...! ایک خواب کا...! ایک عزم کا....! ایک کاوش کا...!

اور اب شیریں سپر اسپیشلٹی ہاسپٹل کشمیر کی روحانی دھرتی پر اِستادہ ہے۔ وہ مسکرا رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ تخریب کتنی بھی خون چکاں کیوں نہ ہو، آخر کار جیت تعمیر کی ہی ہوتی ہے۔

یہ اسپتال علامیہ ہے، انسانی عظمت کا...! خدمت خلق کا....! انسان دوستی کا...!

ڈاکٹر مہک ملک کو خیال آیا کہ کیوں نہ اسی بہانے اسپتال کی بنیاد کی سالانہ تقریب منائی جائے اور اسپتال میں سبھی کام کرنے والوں کو مٹھائی بانٹی جائے۔ اس نے دو تین ملازموں کو بلا کر مٹھائی خریدنے اور سارے اسپتال میں بانٹنے کا کام سونپ دیا۔ مریضوں میں میوہ جات

بانٹے گئے کیونکہ بہت سارے مریض مٹھائی نہیں کھا سکتے تھے۔

خود اس نے اپنے لیے چائے اور مٹھائی کا آرڈر کیا۔ پھر گوتم کو بھی بلایا۔ سوچا اسی بہانے ملاقات ہوگی، اس کو جنم دن کی مبارک باد دی جاسکتی ہے اور اس کے ساتھ بیٹھ کر چائے پی جاسکتی ہے۔ کچھ وقفے کے بعد گوتم حاضر ہوا۔ ڈاکٹر مہک ملِک کمرے میں صوفے پر بیٹھی اس کا انتظار کررہی تھی۔ وہ بھی آکر ساتھ ہی صوفے پر بیٹھ گیا۔ سب سے پہلے تو ڈاکٹر مہک نے گوتم کو یوم ولادت کی مبارک باد پیش کی اور دعا کی کہ یہ دن ہزاروں بار آئے۔ گوتم اس کی اس دعا کو سن کر مسکرادیا۔ پھر دونوں چائے نوش فرمانے لگے۔

کچھ وقفے کے بعد دونو جوان ڈاکٹر مہک ملِک کے کمرے میں زبردستی داخل ہو گئے ۔ان کے سیدھے ہاتھ میں ریوالور تھے جن کا نشانہ انھوں نے گوتم کی جانب باندھ دیا۔ ڈاکٹر مہک ملِک سکتے میں آگئی ۔ گوتم کی جان کو خطرہ دیکھ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور اس نے بجلی کی رفتار سے گوتم کے گرد حصار باندھنے کی کوشش کی۔ دوسری طرف ریوالور سے اندھا دھند گولیاں چلنے لگیں جو ڈاکٹر مہک ملِک اور گوتم سپرو کے سینوں کو پار کرگئیں اور ان میں سے خون بہنے لگا۔

"ہے رام! ڈاکٹر مہک...! آپ نے یہ کیا کیا؟ کم سے کم آپ تو خود کو بچا سکتی تھیں اور اس اسپتال کی دیکھ بھال کرسکتی تھیں۔" گوتم کا خون بہہ رہا تھا اور وہ بغیر پانی کی مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد اس کے حلق سے آواز نکلنا بند ہوگئی۔ وہ کھلی آنکھوں سے ڈاکٹر مہک کو دیکھتا رہ گیا جیسے اگلے سفر پر نکلنے سے پہلے اس کی تصویر آنکھوں میں سمونا چاہتا ہو۔

"ارے درندو، انسانیت کے دشمنو، تم نے آج انسان کا لہو بہایا ہے۔ مجھے نہیں معلوم تم کو آزادی ملے گی یا نہیں، مگر ہم دونوں کو تو آزادی مل گئی۔ اِس مکروہ بستی سے ہمیں چھٹکارہ مل گیا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اُس جہاں میں تم جیسے مذہب کے دلال نہیں ہوں گے۔ اللہ حافظ!" ڈاکٹر مہک چھٹپٹاتی ہوئی دونوں ملی ٹنٹوں کو مخاطب کرکے بولی اور پھر آخری سانس لے کر فرش پر

لڑھک گئی۔

دونوں ملی ٹنٹ اپنی پستولوں کے میگزین خالی کر کے کمرے سے باہر دوڑتے ہوئے چلے گئے اور سامنے کھڑی موٹر بائیسکل پر بیٹھ کر بھاگ گئے۔

اسپتال کی بانی، ڈاکٹر مہک ملِک کا کمرہ خون سے لالہ زار ہو چکا تھا۔ مہک اور گوتم کا خون فرش پر ہر جگہ پھیل چکا تھا۔ اس نے گوتم کو بچانے کے لیے اس کے ارد گرد گھیرا ڈال دیا تھا مگر بچا نہ سکی اور اس کارروائی میں خود بھی گولیوں کا شکار ہو گئی۔ اسپتال کے ملازموں نے جونہی فائرنگ کی آوازیں سنیں وہ کمرے کی جانب دوڑتے ہوئے چلے آئے۔ آہ و زاری کرتے ہوئے ملازم ہر سو نظر آ رہے تھے۔ سارے اسپتال میں ماتم چھا گیا۔ مریضوں کو بھی جونہی پتہ چلا وہ بھی پریشان و غمزدہ ہو گئے۔

کچھ دیر میں پولیس پہنچ گئی اور پوسٹ مارٹم کے لیے لاشوں کو اپنی تحویل میں لے گئی۔ پولیس کے چند اعلیٰ افسر بھی تفتیش کے لیے پہنچ گئے اور اسپتال میں ملازموں سے پوچھ گچھ کرنے لگے۔ کمرے کو سیل کر لیا گیا اور خون و انگلیوں کے نشانات فورینسِک لیبارٹری کے لیے لے گئے۔ چند دنوں کے بعد کمرے کا قفل توڑا گیا اور اس کی صفائی کی گئی۔

دوسرے روز مقامی اخباروں، ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر یہ خبر پوری طرح چھائی رہی۔ عام لوگوں میں غم و غصہ صاف نظر آ رہا تھا مگر کوئی زبان پر نہیں لا رہا تھا۔ ہر کوئی ڈاکٹر مہک ملِک کی غریب پروری اور خدمت خلق کا مدح سرا تھا۔ سب کو افسوس ہو رہا تھا کہ اس کے چلے جانے سے بہت بڑا خلا پیدا ہو جائے گا۔

اُدھر ابو سلمان اور اس کی عسکری تنظیم میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ انھوں نے اپنے پبلسٹی شعبے کے توسل سے لوگوں کو باور کرانے کی کوشش کی کہ ڈاکٹر مہک ملِک ہندوستانی فوج کے لیے مخبری کا کام کر رہی تھی مگر لوگوں نے مجاہدوں کی اس دعوے کو یکسر خارج کر دیا کیونکہ ان کو یقین تھا کہ وہ فرشتہ صفت کشمیر کی لاڈلی بیٹی تھی اور کشمیریوں کی ہمدرد تھی۔

پولیس دونوں لاشوں کا پوسٹ مارٹم کر کے دن بھر اس انتظار میں رہی کہ ان کا کوئی نہ کوئی رشتے دار لاش پر حق جتائے گا مگر کوئی سامنے نہیں آیا اس لیے پولیس نے ہی ان دونوں کے آخری رسوم کا فرض نبھایا۔ ڈاکٹر مہک کے جنازے کے ساتھ ہزاروں لوگ جلوس کی صورت میں قبرستان تک چلے گئے اور نماز جنازہ میں شریک ہو گئے۔ اُدھر گوتم سپرو کی لاش کو بھی پولیس نے ہی شمشان گھاٹ تک پہنچا دیا اور وہاں پر اس کا انتم سنسکار کیا۔

(۴۱)

پولیس کو اس کیس کی تفتیش کرنے میں کافی دن لگ گئے۔ آخر کار شک کی سوئی الجہاد کشمیر کے سرغنہ خالد بٹ عرف ابن سلمان پر پڑ گئی جس کو پولیس کئی مہینوں سے تلاش کر رہی تھی۔ کبھی خبر مل جاتی کہ وہ سرحد پار چلا گیا ہے اور کبھی مخبر اطلاع دیتے کہ وہ واپس آ چکا ہے اور پھر سے فعال ہو چکا ہے۔

اس کے سبھی ٹھکانوں پر نظر رکھی جا رہی تھی۔ خوش قسمتی سے کسی نے خبر دی کہ وہ اپنی بیوی اور بچے کو ملنے کے لیے اس کے میکے آیا ہوا ہے۔ سیکورٹی فورسز نے فوراً سارے علاقے کی گھیرا بندی کر لی اور سب نکاسوں کی ناکہ بندی کر لی تاکہ وہ کہیں سے بھاگ نہ پائے۔ اس بار وہ چوکنا ہو چکا تھا کیونکہ اس کو معلوم تھا کہ ڈاکٹر مہک کی ہلاکت کے بعد پولیس اس کو تلاش کرے گی، اس لیے دو اور ساتھیوں کو اپنے ساتھ لے گیا تھا جو مکان کے باہر اس کی رکھوالی کر رہے تھے۔ مگر پولیس نے ان کو خبر تک نہ ہونے دی جب تک اس علاقے کی گھیرا بندی کر لی اور پولیس کے کچھ ہتھیار بند آدمی مکان کے نزدیک پہنچ گیے۔ انھوں نے دونوں ملی ٹنٹوں کو دیکھتے ہی مار ڈالا اور پھر مکان کے اندر گھسنے کی تیاری کرنے لگے۔ اس سے پہلے انھوں نے ابو سلمان کو چیتاونی دی کہ اس کو گھیر لیا گیا ہے اور اس کے فرار ہونے کے سبھی راستے بند کیے گئے ہیں، اس لیے بہتر یہی رہے گا

کہ وہ خود کو پولیس کے حوالے کر دے۔

جواب میں مکان کی کھڑکی سے پولیس پر گولیاں چلیں جبکہ پولیس تحمل سے کام لے کر اندر جانے کے راستے تلاشنے لگی۔ دوسری جانب ابوسلمان کی بیوی ساحرہ اپنے بچے کو گود میں اٹھا کر عقبی دروازے سے نکلی اور خود کو پولیس کے حوالے کر دیا۔ بہت انتظار کے بعد پولیس نے مکان پر حملہ کر دیا۔ کچھ پولیس والے مکان کے اندر گھس گئے اور گولی باری کرتے رہے۔ آخر کار گولیوں کی زد میں خالد بٹ عرف ابوسلمان آ گیا اور وہیں پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کی اور اس کے دوساتھیوں کی لاشیں پولیس نے اپنے ساتھ لیں اور ان کا پوسٹ مارٹم کر کے ان کی ہلاکت کا اعلان کر دیا۔

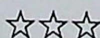
اگلے روز خالد عرف ابوسلمان کی لاش اس کی ماں جمیلہ کے حوالے کر دی گئی۔

(۴۲)

ڈاکٹر مہک ملِک مرحوم کا وصیت نامہ اس کے وکیل نے سرکار کو پیش کیا جس کے مطابق شیریں سپر اسپیشلٹی ہسپتال کو سرکار نے اپنی تحویل میں لے لیا اور اس کے انتظام کے لیے ایک بورڈ تشکیل دیا جس میں گورنر کے علاوہ ہائی کورٹ کا ایک جج اور اسپتال کا ایک اسپیشلسٹ ڈاکٹر شامل کیے گئے اور کچھ روز کے بعد اسپتال کا کام روزمرہ کی طرح چلنے لگا۔

انتظامیہ کمیٹی کی سفارش پر ڈاکٹر مہک ملِک کا ایک مجسمہ بنوایا گیا جس کو اسپتال کے سنٹرل بلاک کے بالکل سامنے باغ میں نصب کیا گیا۔ اس تقریب میں گورنر کے علاوہ وادی کے اعلیٰ افسر، کورٹ کے جج اور اسپتالوں کے سینئر ڈاکٹروں کو مدعو کیا گیا۔ سب کی یہی رائے تھی کہ اس چھوٹی سی عمر میں ڈاکٹر مہک ملِک نے انسانیت کے لیے جو کام کر دکھایا وہ کسی دوسرے کے بس کی بات نہیں۔

اسپتال اس سانحہ کے بعد بھی غریب اور پسماندہ عوام کی خدمت میں جٹا ہوا ہے۔



مصنف کی تصانیف

☆ افسانوں/افسانچوں کے مجموعے:

۱)ادھورے چہرے(ایڈیشن سوم۲۰۱۴، ہندی ۲۰۰۵ء) ۲)چنار کے پنجے(ایڈیشن دوم۲۰۱۴ء، ہندی ۲۰۱۱ء)

۳)زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی (ایڈیشن دوم ۲۰۱۸ء) ۴)ریزہ ریزہ حیات (۲۰۱۱ء)

۵)روح کا کرب (۲۰۱۵ء) ۶)مٹھی بھر ریت[افسانچے](۲۰۱۵ء)

۷)اب میں وہاں نہیں رہتا(۲۰۱۷ء) ۸)جڑوں کی تلاش (۲۰۱۹ء)

۹)یہ کیسا رشتہ![افسانچے] (۲۰۲۱ء) ۱۰)پتّوں پر لکھی تحریریں (۲۰۲۲ء)

۱۱)اپنا اپنا سچ (۲۰۲۲ء)

☆ناول:

۱۲)آزادی (زیر اشاعت) ۱۳)سیندور کی سوگندھ (زیر اشاعت)

☆خود نوشت سوانحعمری:

۱۴)لوحِ حیات(۲۰۱۸ء)

☆ تنقید و تبصرے:

۱۵) عصری تحریریں (۲۰۰۶ء) (۱۶) عصری شعور (۲۰۰۸ء)

۱۷) عصری تقاضے (۲۰۱۳ء) (۱۸) عصری تناظر (۲۰۱۸ء)

۱۹) عصری نقوش (۲۰۱۹ء) (۲۰) جموں وکشمیر کا عصری ادب(۲۰۱۹ء)

۲۱) ادبی مباحثے (۲۰۱۹ء) (۲۲) عصری زاویئے (۲۰۲۰ء)

۲۳) کرشن چندر- میری نظر میں (۲۰۲۱ء) ۲۴)عصری رجحانات (۲۰۲۲ء)

۲۵) عصری تخلیقات (زیرِطبع) ۲۶)اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار(ایڈیشن دوم ۲۰۲۰ء)

☆ تحقیق:

ملنے کا پتہ

(۱) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، D-1/16 انصاری روڈ، دریا گنج، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲

(۲) میزان پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرس، بٹہ مالو، سرینگر، کشمیر-۱۹۰۰۰۹

(۳) جی این کے پبلی کیشنز، کمار محلہ، چرار شریف، بڈگام، کشمیر-۱۹۱۱۱۲



AZADI

(Novel)

By

Deepak Budki

صنف کے بارے میں

نام : دیپک کمار بدکی

لمی نام : دیپک بدکی

یدائش : ۱۵؍فروری ۱۹۵۰ء بمقام– سرینگر، جموں وکشمیر

ڈریس : ۱۰۲-اے، ایس جی امپریشن، سیکٹر۴-بی، وسُندھرا، غازی آباد-۲۰۱۰۱۲

ی میل : deepak.budki@gmail.com موبائیل: 9868271199

علیم : ایم ایس سی، بی ایڈ؛ ایسوسی ایٹ، انشورنس انسٹی ٹیوٹ آف انڈیا، این ڈی سی۔

یشہ : ریٹائرڈ ممبر، پوسٹل سروسز بورڈ، نئی دہلی؛ ۹ سال آرمی پوسٹل سروس (لیفٹننٹ کرنل)۔

کارنامے : تقریباً ۱۵۰؍افسانے، ۱۷۰؍افسانچے، ۲۷۵ تبصرے اور ۸۰ تنقیدی و تحقیقی مضامین؛ افسانے ہندی، تیلگو، مراٹھی، بنگالی، کشمیری، پہاڑی اور انگریزی میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔ دو ترجمہ شدہ کتابیں ہندی میں اور ایک انتخاب انگریزی میں شائع ہو چکا ہے۔ انگریزی/ بنگالی کی ۳؍اینتھالوجیوں میں ۳؍افسانے شامل کیے گئے ہیں۔ ایک کہانی دوردرشن کشمیر پر ٹیلی وائز ہوئی اور کئی کہانیاں آل انڈیا ریڈیو کشمیر اور اردو سروس سے نشر ہوئیں۔

صانیف : (افسانے): ادھورے چہرے، چنار کے پنجے، زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی، ریزہ ریزہ حیات، روح کا کرب، اب میں وہاں نہیں رہتا، جڑوں کی تلاش؛ (افسانچے): مٹھی بھر ریت، یہ کیسا رشتہ؛ (سوانح عمری): لوحِ حیات ؛(مضامین و تبصرے): عصری تحریریں، عصری شعور، عصری تقاضے، عصری تناظر، عصری نقوش، ادبی مباحث، جموں وکشمیر کا عصری ادب، عصری زاویے؛ کرشن چندر–میری نظر میں (تحقیق): اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار

قالہ(for ndc): Genesis of Kashmir Problem & Article 370

صوصی نمبر : 'انتساب عالمی'، سرونج (دیپک بدکی نمبر)، جولائی تا ستمبر ۲۰۱۶ء

وشے : 'شاعر' ممبئی ستمبر ۲۰۰۴ء، 'انتساب' سرونج ۲۰۰۶ء، 'اسباق' پونے جولائی ۲۰۰۷ء، سہ ماہی 'عالمی میراث' پونے ۲۰۲۰ء

عامات : راشٹریہ گورَو سمان (انٹرنیشنل فرینڈ شپ سوسائٹی) ۲۰۰۹ء؛ ڈاکٹر منظر کاظمی ایوارڈ برائے فکشن ۲۰۱۹ (چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی)

ISBN 978-93-95400-80-0



EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
New Delhi, INDIA
www.ephbooks.com